بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم　　وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

خدا کے فضل اور رحم کیساتھ

ٹی آئی کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی

دسمبر ۲۰۱۲

نگران۔ پروفیسر چوہدری حمید احمد۔ صدر تعلیم لاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن۔ جرمنی

ایڈیٹر۔ چوہدری انیس احمد۔ سیکرٹری تعلیم لاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن۔ جرمنی

مینیجر۔ چوہدری نصیر احمد

ترتیب وڈیزائن۔ محمد ظہیر احمد۔ Software Engineer

ادارہ المنار اپنے قارئین کی خدمت میں

نئے سال کی مبارک باد

عرض کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، آپ کے اہل و عیال کو، دوست احباب کو عید کی برکات سے نوازے۔ ہر لمحہ آپکو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور آپ کو ہر قسم کی روحانی اور دنیاوی خوشیاں نصیب کرے۔ آمین

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	ارشاد باری تعالیٰ۔ حدیث نبوی اور فرمان حضرت مسیح موعود علیہ السلام	۱
۲	فرمان حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ	۲
۳	حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کی یاد دہانی	۳
۴	پیش لفظ۔ صدر ایسو سی ایشن	۴
۵	اداریہ۔ انیس احمد چوہدری سیکرٹری ایسوسی ایشن	۵
۶	تقسیم ہند کے بعد تعلیم الاسلام کالج کا اجراء لاہور میں۔ مولانا فضل الٰہی انوری۔	۷
۷	تعلیم الاسلام کالج کی روایات۔ پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی۔ کینیڈا	۱۶
۸	کالج کے بانی پرنسپل حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ۔ منیر احمد باجوہ۔ ہمبرگ	۲۶
۹	شریف الرحمان مرحوم کی یاد میں۔ عثمان احمد خان، فرانکفورٹ	۳۱
۱۰	نظم۔ راجہ محمد یوسف خان	۳۵
۱۱	بہار ضرور اُترے گی ۔ ڈاکٹر عمران احمد خان۔ ربوہ	۳۷
۱۲	امریکہ میں مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج کا قیام۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خان۔ امریکہ	۴۱
۱۳	نظم۔ پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان مرحوم۔ المنار کے پرانے شمارہ سے ماخوذ	۴۴
۱۴	جرمن سیکشن	
۱۵	انگریزی سیکشن	

ارشاد باری تعالیٰ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

اور رحمان کے سچے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے لئے سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

حدیث نبوی

عن ابن عمر و عائیشه قالا: قالا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، ما زا جبریل یو صینی بالجار حتی ظننت انه سیورثه

[بخاری کتاب الادب]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبریل ہمیشہ مجھے پڑوسی سے حسن سلوک کی تاکید کرتا آرہا ہے یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا کہ کہیں وہ اسے وارث ہی نہ بنادے۔

فرمان حضرت مسیح موعود علیہ السلام

ان سب باتوں کے بعد میں پھر کہتا ہوں کہ یہ مت خیال کرو کہ ہم نے ظاہری طور پر بیعت کرلی ہے۔ ظاہر کچھ چیز نہیں۔ خدا تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے اور اسی کے موافق تم سے معاملہ کرے گا۔ دیکھو میں یہ کہہ کر فرض تبلیغ سے سبکدوش ہوتا ہوں کہ گناہ ایک زہر ہے۔ اس کو مت کھاو۔ خدا کی نافرمانی ایک گندی موت ہے۔ اس سے بچو۔ دعا کرو تا تمہیں طاقت ملے۔ جو شخص دعا کے وقت خدا کو ہر بات پر قادر نہیں سمجھتا بجز وعدہ کی مستثنیات کے وہ میری جماعت میں سے نہیں۔

فرمان حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ

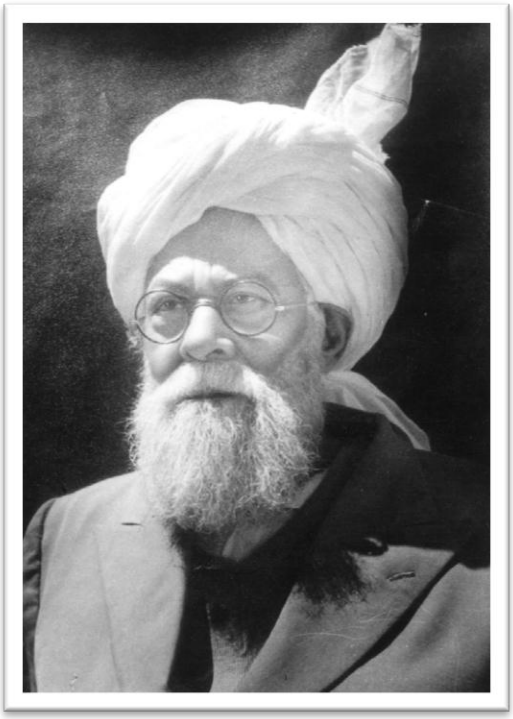

مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۵۴ کو حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ نے تعلیم الاسلام کالج کا ربوہ میں افتتاح کرتے ہوئے فرمایا:

"تعلیم الاسلام کالج کا صرف یہ مقصد ہی نہیں کہ وہ صرف دینی ہی تعلیم تمہیں دے بلکہ وہ تمہیں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی دے گا۔ تا تم خدا کی شان دیکھو اور سوچو کہ خدا تعالیٰ نے دنیا میں کیا کچھ تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے" حضور نے غیر احمدی طلباء سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

"تم یہ مت خیال کرو کہ ہے تمہیں مجبور کیا جائے گا کہ تم احمدی جماعت کے عقائد اختیار کرو۔ ہر گز نہیں۔ تم جس بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہو اس کے مطابق خدا کی عبادت میں مصروف رہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ایک عیسائی کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی عیسائیت پر پورا پورا ے یقین نہ رکھتا ہو۔ اور ایک یہودی کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ یہودیت کے اصولوں پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو۔ اسی طرح ایک مسلمان کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسلام کے صحیح عقائد پر عمل پیرا نہ ہو۔ اور اس کے صحیح عقائد وہی ہیں جن کو وہ صحیح سمجھتا ہے۔ پس تم اپنے عقائد پر قائم رہو اور تعلیم حاصل کرو۔ تمہارا مطمع نظر صرف اور صرف تعلیم ہونا چاہئے"۔

آخر میں حضور نے طلباء کی توجہ کالج کی روایات کو برقرار رکھنے کی طرف مبذول کروائی۔

منقول از المنار ۱۹۵۴

یاد دہانی

ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ

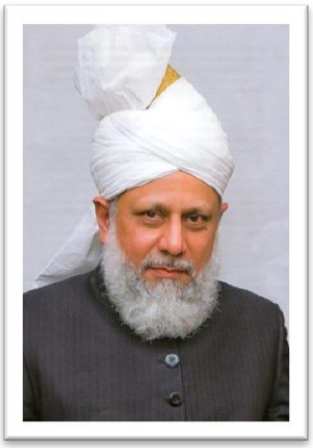

مورخہ ۲۴ ستمبر کو حضور ایدہ اللہ تعالیٰ از راہ شفقت کالج کے سابق طلباء کے سالانہ ڈنر میں بنفس نفیس شامل ہوئے اور اپنے خطاب میں جہاں آپکی اس تنظیم کو poineer ہونے کا درجہ دیا اور وظائف کی اس سکیم پر خوشنودی کا اظہار فرمایا اور آپ کا شکریہ ادا کیا ساتھ ہی اس خواہش کا بھی اظہار فرمایا کہ پاکستان کے حالات کا تقاضا ہے کہ وظائف کی اس پیشکش کو وسعت دی جائے۔ حضور کے اس خطاب کی full text تو الفضل ربوہ مورخہ ۱۳۔اکتوبر میں چھپ چکی ہے۔ خاکسار حضور کی ہدایات جن پر ہمیں فوری عمل کرنا ضروری ہے آپکی خدمت میں پیش کرتا ہے اس امید کے ساتھ کہ آپ ان امور کی طرف فوری توجہ دیں گے۔

۱۔فرمایا"چھ سال میں آپکو بہت آگے بڑھ جانا چاہئے تھا۔ بعض کام جو ہونے چاہئیں تھے اور جو وعدے تھے۔جو جذبہ تھا اس کو قائم نہیں رکھا جاسکا۔نہ صدر نہ انتظامیہ قائم رکھ سکتی ہے جب تک ہر ممبر میں ایک جوش اور جذبہ نہ ہو"

پھر فرمایا"ماں کے طرح اس درسگاہ نے ہمیں سنبھالا ہے۔اس کی لاج رکھتے ہوئے جو منصوبے آپ نے بنائے ہیں ان کو پورا کرنے میں بھرپور کردار ادا کریں"

فرمایا"ممبر شپ کو وسیع کریں۔اپنے بچوں کو ساتھ شامل کریں۔المنار کا اجراء کریں اور اس میں ایک صفحہ جرمن زبان میں شامل کریں"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حمید احمد چوہدری
صدر ایسو سی ایشن

الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ کا المنار آپ کی خدمت میں ایک بار پھر پیش کیا جارہا ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کی دعا وں کا ثمرہ ہے کہ ہمارے لئے یہ بظاہر ناممکن کام ممکن ہو سکا ہے۔ جب حضور نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ ہمیں المنار بھی جاری کرنا چاہئے تو میں تو گھبرا گیا تھا کیونکہ یہاں جرمنی میں ہمارے پاس کوئی دوست بھی اس کام کی حامی بھرنے کو تیار نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ بھلا کرے میرے شفیق دوست محترم پرفیسر چوہدری حمید اللہ صاحب۔ وکیل اعلیٰ تحریک جدید کا جن سے میں نے اپنی گھبراہٹ کا اظہار کیا تو انہوں میرا بوجھ اپنے ذمہ لے کر المنار ربوہ سے تیار کروا کر شروع کروادیا۔ میری ناشکر گزاری ہو گی اگر میں مکرم کلیم احمد قریشی صاحب کا ذکر نہ کروں جنہوں نے بڑی محبت سے پہلا شمارہ تیار کیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی اور ہمیں ایک بہت قابل نوجوان مکرم محترم محمد ظہیر احمد صاحب software engineer کی ذات میں ایک قوی معاون عطاء فرمادیا۔ اور اب وہی تمام امور میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ ان کے علاوہ میں ان تمام دوستوں کا بھی ممنون ہوں جن کے مضامین رسالہ کی زینت بنتے ہیں۔

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی خدا کے فضل سے اپنی زندگی کے ساتویں سال میں داخل ہو رہی ہے۔ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اگرچہ یہ بچپن کی عمر ہے مگر یہ بچپن ان لوگوں کا ہے جن کی داڑھیاں سفید ہو چکی ہیں۔ حضور نے فرمایا اب تک آپ لوگوں کو بہت آگے نکل جانا چاہئے تھا۔ جن معین امور کی طرف حضو ایدہ اللہ تعالیٰ نے توجہ مبذول کرائی ان کا اختصار کے ساتھ یادہانی میں ذکر کیا گیا ہے۔ خدا کرے ہم حضور کی ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرتے رہیں۔ دوران سال ایڈوائزری کمیٹی کے چار اجلاس ہوئے۔ حسب وعدہ صدر انجمن احمدیہ کی خدمت میں آپ کی پیش کردہ سکالرشپس کی رقم بھجوائی گئی۔ ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس کا موضوع تھا" مغربی معاشرے میں ہمارے بچوں کے مسائل"۔ جنوری میں انشاء اللہ ایک مشاعرہ کے انعقاد کا پروگرام ہے اسی طرح ایڈوائزری کمیٹی نے سال نو کے آغاز میں جنرل میٹنگ اور ڈنر کا فیصلہ بھی کیا ہے۔

اس موقع پر میں اپنے کینیڈا کے دوستوں کی خدمت میں بھی ان کے جرمنی میں مقیم بھائیوں کی طرف سے مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے نہ صرف باقاعدہ ایسوسی ایشن کا آغاز کر لیا ہے بلکہ سکالرشپ سکیم کے لئے ایک معقول رقم بھی حضور کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔ اللھم زد فزد

اداریہ

انیس احمد چوہدری
سیکرٹری تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور ممبران کے تعاون سے جنہوں نے مضامین ارسال کئے المنار کا چوتھا شمارہ پیش خدمت ہے۔ بعض مضامین تو تاریخی نوعیت کے ہیں جن میں کالج کی تاریخ کے ساتھ جماعتی تاریخ کا بھی علم ہوتا ہے۔ امید ہے آئندہ شماروں میں بھی دوست ایسے ہی مضامین لکھتے رہیں گے تو المنار کی افادیت بڑھانے میں کام آئیں گے۔ مورخہ ۱۸ نومبر ۲۰۱۲ کو ایسوسی ایشن کی ایڈوائزری کمیٹی کی چوتھی میٹنگ ہوئی۔ اس میں ممبر شپ کو فرانکفورٹ سے باہر کے شہروں خصوصا ہمبرگ اور کولون وغیرہ میں توسیع دینے پر غور کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ایک وفد ہمبرگ جائے اور وہاں جا کر کالج کے سابق طلباء سے رابطہ کرے۔ مکرم منور احمد باجوہ صاحب نے کولون کے علاقہ میں رابطے کرنے کا عزم کیا۔ اسی طرح حضور ایدہ اللہ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنے بچوں کو ساتھ شامل کرنے کے معاملہ پر بحث کرتے ہوئے محترم صدر صاحب ایسوسی ایشن نے بتایا کی دوران سال پندرہ بچے ممبر شپ لے چکے ہیں تاہم یہ تعداد بہت کم ہے۔ دوستوں سے درخواست ہے کی حضور کی یہ خواہش پوری کرنے میں تعاون کریں اور اپنے بچوں کو ممبر بنائیں۔ دوران سال ۱۷ ممبران نے ایک وظیفہ کی مکمل رقم تین سو یورو ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ خدا کے فضل سے سب نے اپنے وعدہ جات ادا کر دئے ہیں۔ بعض نے اس سے زائد رقم بھی ادا کی ہے۔ مکرم داود احمد چیمہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تین وظائف کی رقم ادا کرنے کی توفیق دی۔ فجزاہ اللہ احسن الجزء۔ امید ہے دوست اس قربانی کو آئندہ سالوں میں بھی صرف قائم رکھیں گے بلکہ اسے آگے بڑھائیں گے۔ دوران سال اپریل میں ایک جنرل میٹنگ منعقد کی گئی جو ایک سیمینار کی شکل میں تھی جس کا موضوع تھا مغربی معاشرہ میں ہمارے بچوں کے مسائل۔ اس میں محترم مولانا حیدر علی ظفر صاحب اور مکرم ڈاکٹر محمود احمد طاہر صاحبان بھی ہماری دعوت پر شامل ہوئے۔

سیمینار کا ایک منظر

یہ پروگرام بہت دلچسپ رہا۔اس میں اور امور کے علاوہ شادی بیاہ کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے مسائل خاص طور پر زیر بحث آئے اور محترم مولانا حیدر علی ظفر صاحب، مکرم ڈاکٹر محمود احمد طاہر صاحب اور خاکسار نے بطور قاضی سلسلہ پیش آنے والے مسائل پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کے پروگرام کی کامیابی کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں دعا کے لئے بھی لکھا گیا تھا اور حضور نے دعا دی تھی۔

اسی طرح مکرم محترم مولانا فضل الہیٰ انوری صاحب کی تصانیف درویشان احمدیت کا بھی تعارف کروایا گیا۔ محترم مولانا صاحب خدا کے فضل سے مالی لحاظ سے بھی ایسوسی ایشن کے نمایاں مددگاروں میں سے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عمر میں برکت دے۔ اس جنرل اجلاس کے بعد حاضرین کی خدمت میں عشائیہ پیش کیا گیا۔

بہت سے دوستوں کی خواہش بار بار سامنے آتی رہی کہ کسی مشاعرہ کا انعقاد کیا جائے۔افسوس ہے کہ باجود اصولی اتفاق کے دوران سال ایسا ممکن نہیں ہوا۔پہلے خیال تھا کہ دسمبر میں مشاعرہ اور سالانہ ڈنر کا پروگرام بنالیا جائے مگر اس امکان پر کہ شاید حضور انور دسمبر میں جرمنی تشریف لا رہے ہیں اس لئے مشکلات پیدا ہوں اس ارادہ کو اگلے سال جنوری پر ڈال دیا گیا ہے۔امید ہے سب دوست اس میں شامل ہوں گے۔

میں دوستوں کی خدمت میں ایسوسی ایشن کے صدر محترم پرفیسر چوہدری حمید احمد صاحب کے لئے بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی عمر اور کمزور صحت کے باوجود بڑی توجہ اور محنت سے ویب سائٹ۔المنار۔فنڈز کے حصول سمیت تقریبا تمام امور چلا رہے ہیں۔

تعلیم الاسلام کالج لاہور کا پہلا اور کالج کا دوسرا سال

از قلم مولانا فضل الٰہی انوری

۱۹۴۶ء میں ایف۔ایس، سی کا امتحان پاس کر لینے کے بعد خاکسار کے لئے پھر سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے کہ اخبار الفضل میں حضرت المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کی طرف سے نوجوانوں کو زندگیاں وقف کرنے کی تحریک شائع ہوئی۔ چنانچہ والدین کی اجازت کے ساتھ خاکسار نے اپنے تعلیمی کوائف پر مشتمل اپنی زندگی وقف کرنے کی درخواست حضور کی خدمت میں بھیج دی۔ حضور کی طرف سے جواب ملا کہ میں فوراً قادیان پہنچ جاؤں۔ چنانچہ اپریل یا مئی ۱۹۴۷ء میں خاکسار نے قادیان پہنچ کر اپنے حاضر ہونے کی رپورٹ کر دی۔ یہ تو یاد نہیں رہا کہ خاکسار کا انٹرویو کس نے لیا تھا مگر فیصلہ یہ ہوا کہ خاکسار کو فضل عمر ریسرچ انسٹی چیوٹ کے لئے لے لیا گیا ہے۔ اس ریسرچ انسٹی چیوٹ کا قیام بھی اولوالعزم خلیفہ نے کالج کے ساتھ ہی فرما دیا تھا۔ اس کے سربراہ مکرم ڈاکٹر عبدالاحد صاحب پی، ایچ۔ڈی تھے۔ وہ خاکسار کو ویسے بھی جانتے تھے کیونکہ ایف۔ایس، سی کی تعلیم کے دوران وہ ہمیں کچھ عرصہ کیمسٹری پڑھاتے رہے تھے۔ انہی کے مشورہ کے مطابق خاکسار کے بارے میں پہلے کیمسٹری میں ایم ۔ایس، سی (M.Sc.) کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ہمارا تعلیم الاسلام کالج اس دوران ڈگری کلاسوں کے لئے منظور ہو چکا تھا۔ داخلے جون یا جولائی میں ہونے تھے۔ چنانچہ خاکسار قادیان ہی میں رہ کر بی۔ایس، سی کلاس کے شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ وہ سال تھا جس میں برصغیر کی آزادی کا مسئلہ اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا اور کہیں کہیں اِکا دُکا ہندو مسلم فسادات بھی ہونے شروع ہو گئے تھے۔ تاہم کسی کے وہم و گمان میں بھی وہ صورت نہ تھی جو ان کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ میرے قادیان میں قیام کے دوران ہی فضل عمر ریسرچ انسٹی چیوٹ کی طرف سے تین افراد پر مشتمل ایک وفد کشمیر میں اس غرض کے لئے بھجوایا گیا کہ وہاں سکے کی بعض کانوں کا جائزہ لیا جائے تاکہ اگر وہ مفید ہوں تو انہیں خرید کر ان پر ریسرچ کی جائے۔ اس وفد کا ایک ممبر خاکسار بھی تھا۔ وہاں سے واپسی کے دوران جب ہماری گاڑی بٹالہ سے قادیان آ رہی تھی تو گاڑی کے وڈالہ گرنتھیاں پہنچنے پر سکھوں نے گاڑی کے ڈرائیور اور چند اَور مسافروں کو زخمی کر دیا۔ جس پر گاڑی وہیں رک گئی اور جملہ مسافر مردوں اور عورتوں کو گاڑی سے اتر

جانے کے لئے کہہ دیا گیا۔ رات کا وقت تھا۔ چنانچہ اس حادثے کی اطلاع فوراً ہی قادیان بھجوادی گئی۔ جہاں سے انتظامات ہونے پر ہم قادیان پہنچ گئے۔ یہ وہ پہلا حادثہ تھا جس کے بعد پنجاب میں حالات مسلسل بگڑنے شروع ہو گئے۔

۱۴؍اگست کو پاکستان کے قیام کا اعلان ہوتے ہی حالات میں یکلخت تیزی آگئی جن کے نتیجہ میں جماعت کا مرکز اپنے تمام تر تعلیمی اور انتظامی اداروں کے ساتھ پاکستان منتقل ہونے پر مجبور گیا۔ تعلیمی ادارے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ جہاں تک ہائی سکول کے قیام کا تعلق تھا تو اس کے لئے تو کہیں نہ کہیں جگہ تلاش کر لی گئی مگر کالج کے لوازمات کے پیش نظر اس کے لئے کسی موزوں مقام کا ملنا ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ پھر اس کے پرنسپل، حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب، جماعتی ضرورت کے ماتحت ابھی قادیان میں ہی تھے۔ آپ کو اندازہ تھا کہ جماعت کی موجودہ مالی حالات کے لحاظ سے کالج کو از سر نو شروع کرنا جماعت کے لئے کس قدر مشکل ہو گا۔ چنانچہ آپ نے قادیان سے مکرم چودھری محمد علی صاحب کو جو لاہور پہنچ چکے تھے، پیغام بھیجا کہ سیدنا حضرت المصلح الموعود کی خدمت میں عرض کیا جائے کہ اگر حضور مناسب خیال فرمائیں تو موجودہ حالات میں کالج کا بوجھ جماعت پر نہ ڈالا جائے۔ مکرم چودھری صاحب موصوف فرماتے ہیں:

''خاکسار نے جب مکرم پرنسپل صاحب کا مشورہ حضور کی خدمت میں عرض کیا تو آپ خاموش رہے۔ حضرت مولوی عبدالرحیم صاحب درد جو قریب ہی بیٹھے تھے، بھی کہنے لگے کہ حضور میرا بھی یہی خیال ہے۔ حضور اس پر بھی خاموش رہے۔ پھر کسی اَور نے بھی یہی مشورہ دیا حتیٰ کہ حضرت میاں بشیر احمد صاحب سے پوچھا گیا تو آپ کا بھی یہی مشورہ تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ اولوالعزم خلیفہ بولا:

''آپ کو پیسوں کی کیوں فکر پڑی ہوئی ہے۔ کالج چلے گا اور کبھی بند نہیں ہو گا''

مکرم چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کہتے ہوئے حضور اتنے جوش سے اور بآواز بلند بولے کہ ہم سب کے دل دہل گئے۔ پھر خاکسار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ

''آسمان کے نیچے پاکستان کی سرزمین پر جہاں کہیں بھی جگہ ملتی ہے، لے لو اور کالج شروع کر دو''

مکرم چوہدری صاحب موصوف مزید فرماتے ہیں کہ حضور کا منشا مبارک چونکہ فی الفور کالج کے قیام و تاسیس کا تھا۔ اس لئے لاہور کے علاوہ بعض دیگر مقامات میں بھی جگہ کی تلاش شروع کر دی گئی۔ ان مقامات میں ایمن آباد، گوجرانوالہ۔ سانگلاہل، راولپنڈی اور لائل پور لائلپور (موجودہ فیصل آباد) شامل تھے۔ مؤاخر الذکر شہر میں آریہ سکول کی متروکہ عمارت ہمیں نہایت

موزوں نظر آئی مگر وہاں کے ڈپٹی کمشنر کے یہ کہنے پر کہ اسے حکومت پاکستان نے کسی اَور مقصد کے لئے ریزرو کر لیا ہے،اس کا خیال ترک کرنا پڑا۔

ابھی کالج کے لئے جگہ کی تلاش جاری تھی کہ حضرت صاحبزادہ میاں ناصر احمد صاحب قادیان میں اپنے مفوضہ فرائض سرانجام دینے کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔ چنانچہ آپ کے پہنچنے پر کینال پارک لاہور میں ایک بوسیدہ عمارت کو محکمہ بحالیات سے

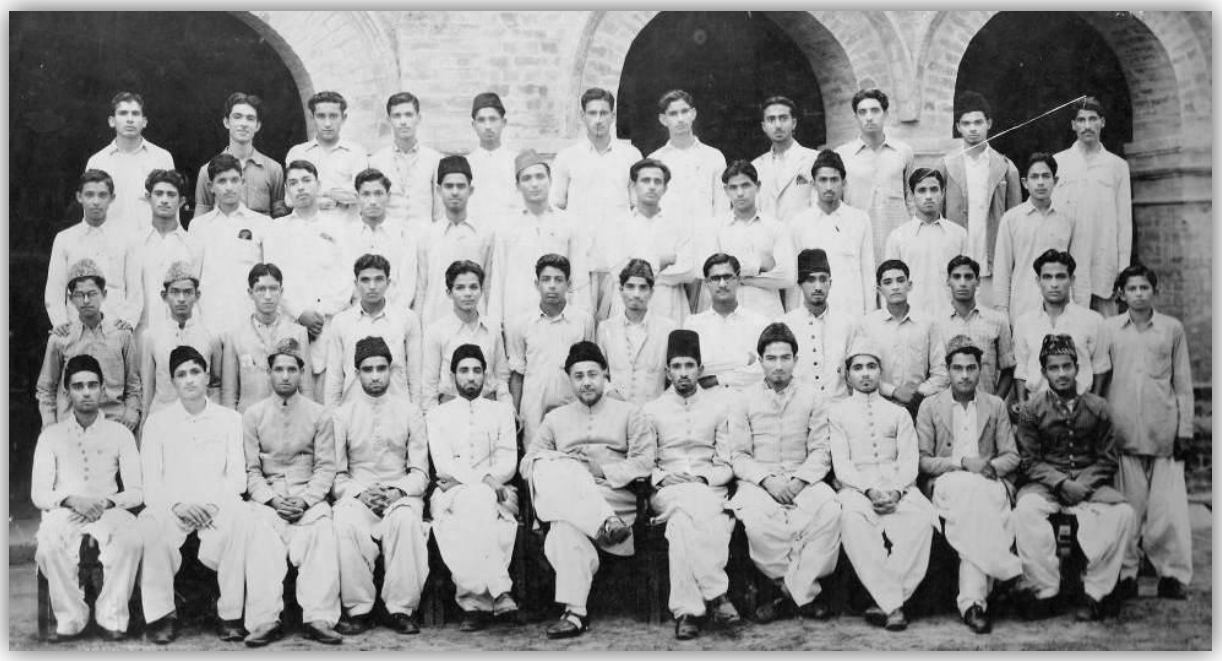

فضل عمر ہوسٹل تعیم الاسلام کالج لاہور کے ابتدائی دور ۱۹۴۸ کے طلباء

حاصل کر کے اس میں تعلیم الاسلام کالج کی کلاسیں شروع کر دی گئیں۔ وہ عمارت کیا تھی اور کس قسم کی سہولیات سے مرصع تھی،اس بارے میں یہاں حضرت صاحبزادہ میاں بشیر احمد صاحب رضی اللہ عنہ کا ایک اقتباس جس میں آپ نے اس عمارت کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے،درج کرنا کافی ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں:

’’آج مجھے اتفاقاً تعلیم الاسلام کالج آف قادیان حال لاہور کو چند منٹ کے لئے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمارا ڈگری کالج جو موجودہ فسادات سے قبل قادیان کی ایک وسیع اور عالیشان عمارت میں اپنے بھاری ساز و سامان کے ساتھ قائم تھا،وہ اب لاہور شہر سے کچھ فاصلے پر نہر کے کنارے ایک نہایت ہی چھوٹی اور حقیر سی عمارت میں چل رہا ہے۔ اس عمارت کا نچلا حصہ قریباً قریباً ایک اصطبل کا سا رنگ رکھتا ہے۔ اور اوپر کی منزل چند چھوٹے چھوٹے کمروں پر جو نہایت سادہ طور پر بنے ہوئے ہیں، مشتمل ہے۔ عمارت کی قلت اور کمی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی عمارت سے کالج اور بورڈنگ کا کام لیا جا رہا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس عمارت

کا صرف ایک کمرہ کالج کے استعمال میں ہے اور باقی کمروں میں بورڈر رہائش رکھتے ہیں۔ باقی کلاسیں برآمدوں میں یا کھلے میدان میں لگتی ہیں۔ چونکہ کوئی ڈیسک اور کوئی میز کرسی نہیں، اس لئے پڑھانے والے اور پڑھنے والے ہر دو چٹائیاں بچھا کر بیٹھتے ہیں"

آگے فرماتے ہیں:

"مجھے یہ نظارہ دیکھ کر وہ زمانہ یاد آگیا کہ جب دینی اور دنیوی ہر قسم کے علوم کا منبع مسجدیں ہوا کرتی تھیں۔ جہاں اسلام کے علماء اور حکماء فرش پر بیٹھ کر اپنے ارد گرد گھیرا ڈالے ہوئے طالب علموں کو درس دیا کرتے تھے۔ اور اس قسم کے درسوں کے نتیجہ میں بعض ایسے شاندار عالم پیدا ہوئے کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود آج کی دنیا بھی ان کے علوم سے روشنی حاصل کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے"

خاکسار عرض کرتا ہے کہ انہی پڑھنے والوں اور صفوں پر بیٹھ کر اپنے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے والوں میں ایک خاکسار بھی تھا۔ خاکسار اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق کالج میں داخلہ لے چکا تھا۔ چنانچہ وہیں اسی عمارت میں دیگر طلبہ کے ساتھ خاکسار کی رہائش بھی تھی۔ اور جب تک کالج شہر لاہور کے اندر ڈی۔اے۔وی کالج کی متروکہ عمارت میں منتقل نہیں ہوا، خاکسار قریباً چھ ماہ کا عرصہ اسی عمارت کا مکین اور اسی کالج کا ایک طالب علم رہا۔ یہاں کالج کی اس پہلی ڈگری کلاس میں بھی خاکسار کو رول نمبر One الاٹ ہوا۔ یہ تو خاکسار کو معلوم نہیں کہ یہ کیسے ہوا یعنی خاکسار کو رول نمبر One کیوں دیا گیا کیونکہ جہاں تک میرے ایف۔ایس، سی میں حاصل کردہ نمبروں کا تعلق ہے، وہ ہرگز دوسرے طلبہ کے مقابلہ میں زیادہ نہ تھے۔ تاہم یہ عجیب اتفاق تھا کہ Intermediate کلاس کی طرح ڈگری کلاس میں بھی خاکسار کو کالج کا پہلا طالب علم ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور اب جبکہ خاکسار اپنے اس کالج سے بی۔ایس، سی کرنے اور پھر ربوہ میں جامعہ احمدیہ سے شاہد کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تین ممالک میں بطور امیر اور مشنری انچارج خدمات سرانجام دے چکا ہے، خاکسار بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ حضرت صاحبزادہ میاں بشیر احمد صاحبؓ کے وہ کلمات جو آپ نے کینال پارک میں کالج کے لئے استعمال ہونے والی اُس بوسیدہ اور حقیر عمارت کے بارے میں فرمائے تھے، اس ناچیز پر بھی صادق آرہے ہیں۔ ولا فخر!

بہتر ہو گا کہ یہاں ڈی۔اے۔وی کالج کی اُس متروکہ عمارت کے بھی کچھ خدوخال بیان کر دئے جائیں جو تعلیم الاسلام کالج کو دی گئی اور جس میں مئی ۱۹۴۸ء میں ہمارا کالج کینال پارک سے منتقل ہو کر آبسا۔ دیکھنے کو تو یہ ایک بہت بڑے کالج کی عمارت تھی۔ مگر اس کی خستہ حالی کا اندازہ کرنے کے لئے خود جناب پرنسپل صاحب کا اپنا بیان پڑھ لینا کافی ہو گا۔ آپ اس بارے میں فرماتے ہیں:

”خاصی تگ ودَو کے نتیجہ میں.....ڈی۔اے۔وی کالج کے کھنڈرات پر ہمیں قبضہ ملا۔ ان عمارتوں کو غیر مسلم پناہ گزین کلی طور پر تباہ و برباد کر چکے تھے۔ دروازوں کے تختے اور چوکھٹیں، روشندان، الماریاں وغیرہ ہر قسم کا فرنیچر غائب تھا۔ عمل گاہوں (لیبارٹریز) میں ٹوٹی شیشیوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے سوا کچھ موجود نہ تھا۔ پانی اور گیس کے نل ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔ تیس چالیس ہزاروں کتابوں پر مشتمل مشہور کتب خانے کی اب ایک جلد بھی باقی نہ تھی “

آگے فرماتے ہیں کہ ہماری فوری توجہ ان ضروری اور ناگزیر مرمتوں کی طرف منعطف ہوئی۔ چنانچہ شروع میں گیس پلانٹ کو درست کروایا گیا اور شعبہ کیمیا کے لئے ضروری سامان خرید کر کیمیا کے عملی تجربے اپنے کالج میں ہی شروع کروادئے گئے۔ طبیعات کے تجربات کے لئے ہمیں ایم۔اے۔او۔کالج سے انتظام کرنا پڑا جن کے برادرانہ سلوک کے ہم ہمیشہ ممنون رہیں گے۔ چونکہ ابھی ہوسٹل پر ہمیں قبضہ نہ ملا تھا، اس لئے کالج کے ہی ایک حصہ کی مرمت کروا کر عارضی طور پر یہ ہوسٹل بنا دیا گیا

جس میں اندازاً پچاس، پچپن طلبہ کی گنجائش تھی جو وقتی طور پر کافی سمجھی گئی مگر عملاً طلبہ اس سے بہت زیادہ آ گئے جس کے نتیجہ میں ایک ایک کمرے میں آٹھ آٹھ طلبہ کو رہنا پڑا"

یہ جملہ مناظر نہ صرف خاکسار کی نظروں سے گزرے بلکہ اس کالج کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے ان میں سے گزرنے کی توفیق بھی پائی۔اس عرصہ میں بعض اَور پروفیسران آکر کالج سٹاف کا حصہ بن چکے تھے۔ان میں قابل ذکر پروفیسر حبیب اللہ خان ہیں جو یو۔پی سے آئے تھے اور جن سے ہم نے کیمسٹری پڑھی۔آپ مکرم مولانا عبدالمالک صاحب مربی سلسلہ کے چھوٹے بھائی تھے ۔پروفیسر سید سلطان محمود شاہد ہیں۔آپ بھی ان دنوں نئے نئے ایم۔ایس، سی کرنے کے بعد کالج سٹاف میں شامل ہوئے تھے۔پروفیسر ملک فیض الرحمن فیضی ہیں جو ملک عبدالرحمن صاحب خادم ،خالد احمدیت ،کے چھوٹے بھائی تھے ۔پروفیسر میاں عطاء الرحمن صاحب اور پروفیسر اخوند محمد عبدالقادر صاحب تو قادیان کے زمانے سے ہی کالج کے ہر دلعزیز پروفیسران کے طور پر چلے آ رہے تھے۔اسی طرح چودھری محمد علی صاحب بدستور کالج ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ اور صوفی بشارت الرحمن صاحب ہوسٹل کے دینی امور کے نگران تھے۔

کالج کی تعلیمی اور تربیتی سرگرمیوں اور اخلاقی اور دینی نظم وضبط کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تفریحی سرگرمیوں کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔مثلاً حضرت پرنسپل صاحب نے کالج کے ڈی۔اے،وی کالج کی عمارت میں منتقل ہوتے ہی دیگر کھیلوں مثلاً کبڈی، بیڈ منٹن، والی بال، فٹ بال، وغیرہ کے علاوہ دریائے راوی کے قرب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طلبہ میں تیراکی کی ترویج کے لئے بھی ایک Swimming Club ترتیب دیا جس میں طلبہ اپنے فارغ اوقات میں حصہ لیتے اور بعض اوقات دیگر کالجوں کے طلبہ کیساتھ تیراکی کے مقابلہ جات بھی کرتے۔اس میں جناب پرنسپل کی ذاتی دلچسپی اور بھرپور پشت پناہی کے نتیجے میں طلبہ نے اس قدر کمال حاصل کیا کہ کالج کے ابتدائی ایام میں ہی ہماری تیراکی کی ٹیم پنجاب روئنگ ایسوسی ایشن کے سالانہ مقابلہ جات میں اول آئی۔اسی طرح موسم گرما میں دریائے راوی پر جا کر پکنک منانا طلبہ کا معمول بن چکا تھا۔اس پکنک میں کھانے پینے کے خصوصی انتظام کے علاوہ رنگارنگ کے لطائف وغرائب بھی ہوا کرتے تھے جن کے تمام تر خاکے عموماً چودھری محمد علی صاحب ہی تیار کیا کرتے تھے۔۱۹۴۹ء کی بات ہے کہ چودھری صاحب موصوف نے اُس سال کی پکنک پر ایک ایسا خاکہ تیار کیا جو طلبہ اور پروفیسران سب کے لئے بے حد دلچسپی کا باعث بنا۔یہ ایک مزاحیہ مباحثہ (Debate) سے عبارت تھا جس کا عنوان رکھا گیا تھا:

"اِس ایوان کی رائے میں بین الاقوامی مسائل کا حل ٹنڈ کروانے میں ہے"

اس مباحثہ میں صرف سٹاف ممبران نے حصہ لینا تھا۔ مگر شرط یہ رکھی گئی کہ وہ پروفیسران جن کی زبان اردو ہے، پنجابی میں بولیں گے اور پنجابی بولنے والے پروفیسران اردو میں بولیں گے۔ پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب جو نئے نئے یو۔پی سے آئے تھے، اس شرط پر بہت سٹپٹائے مگر چودھری محمد علی صاحب جو اس پروگرام کے کرتا دھرتا تھے، انہوں نے ان کی ایک نہ سنی۔ خیر جب سٹیج تیار ہوئی تو صدارت کے لئے شیخ روشن دین تنویر صاحب، ایڈیٹر روزنامہ الفضل جو اس موقع پر بطور مہمان خصوصی مدعو تھے، کو دعوت دی گئی جو انہوں نے بصد خوشی قبول کی۔ اب جب چودھری صاحب موصوف نے مباحثہ کی دیگر شرائط سناتے ہوئے یہ کہا کہ اگر ایوان نے مباحثہ کے عنوان کے حق میں رائے دی تو صاحب صدر کو ٹنڈ کروانی پڑے گی تو شیخ روشن دین صاحب یہ کہتے ہوئے کرسی صدارت سے اچھل پڑے کہ ''دہائی خدادی، میں صدارت کرنے سے باز آیا''۔ خیر بڑی مشکل سے اور بڑی منت سماجت کے بعد انہیں صدارت کے فرائض ادا کرنے پر راضی کیا گیا۔ اب جو مباحثہ شروع ہوا تو جس طرح کا عنوان تھا، مقررین بھی اسی طرح عنوان کے حق میں اور عنوان کے خلاف دُور دُور کی کوڑیاں لانے لگے جس سے ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ سب سے زیادہ رونق اُس وقت پیدا ہوئی جب پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب عنوان کے خلاف بولتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی پنجابی میں اپنا موقف ادا کرنے لگے۔ تاہم جب وہ اپنے اس جملہ پر پہنچے کہ '' اگر ٹنڈیں کرائی گئیں تو اولے پڑیں گے، اور اگر اولے پڑے تو فصلیں خراب ہونگی، اور فصلیں خراب ہوئیں تو بین الاقوامی مسائل بڑھیں گے، کم نہیں ہونگے۔ اس لئے میں عنوان کے خلاف اپنی رائے دیتا ہوں''

تو اس قدر مزاح پیدا ہوا کہ راوی کا پانی بھی اچھلنے لگ گیا۔ اُدھر صاحب صدر بھی ٹنڈ کرانے سے بچ گئے۔

اب مزاح سے ہٹ کر تعلیم الاسلام کالج کی اُس عظیم المرتبت ہستی سے تعلق رکھنے والا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس کی عظمت کردار اور عظمت گفتار نے کالج کو ہمیشہ چار چاند لگائے رکھے۔ میری مراد اس سے حضرت مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل تعلیم الاسلام کالج کی ذات بابرکات ہے۔ آپ کے اخلاق کریمانہ اور الطاف خسروانہ کا دائرہ صرف اپنے کالج تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس نے غیروں کے اندر بھی وہ اثر پیدا کیا کہ اس کی بدولت تعلیم الاسلام کالج ملک بھر میں عزت اور وقار کی علامت بن گیا۔ اوپر کالج کی تیراکی کی ٹیم کا دوسرے کالجوں کے طلبہ کیساتھ مقابلہ جات کا ذکر ہوا ہے۔ ایک ایسے ہی مقابلے کا حال اور اس میں مکرم پرنسپل صاحب (حضرت مرزا ناصر احمد صاحب) کی بیدار مغزی اور ہر دلعزیزی کا ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اُس وقت ہمارے کالج کی تیراکی کی ٹیم کا غالباً اسلامیہ کالج لاہور کی ٹیم کے ساتھ ''بمپنگ بوٹ ریس (Bumping Boat Race) کا مقابلہ تھا۔ دریا پر دونوں کالجوں کے پرنسپل صاحبان اور طلبہ موجود تھے اور مقابلہ شروع ہونے کا انتظار کر رہے

تھے۔ فضا میں کسی قدر کدورت تھی۔ اچانک پرنسپل صاحب اسلامیہ کالج نے مائیک پر اعلان کیا کہ اگر اسلامیہ کالج کی ٹیم جیت گئی تو وہ اسے سو روپے انعام دیں گے۔ اس پر پرنسپل صاحب تعلیم الاسلام کالج فوراً ہی مائیک پر تشریف لائے اور اعلان فرمایا کہ اگر اسلامیہ کالج کی ٹیم جیت گئی تو آپ بھی اسے سو روپے انعام دیں گے۔ بس پھر کیا تھا۔ فوراً فضا بدل گئی اور ایک نہایت خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے زور سے ''پرنسپل تعلیم الاسلام کالج، زندہ باد'' کا نعرہ بلند کیا۔ حسن اتفاق سے اس مقابلہ میں تعلیم الاسلام کالج کی ٹیم اوّل آئی۔

آخر پر خاکسار تحدیث نعمت کے طور یہاں بھی کالج کے اس دَور سے تعلق رکھنے والی اپنی ایک خواب بیان کرنی چاہتا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں خاکسار بی۔ ایس، سی کے فائنل امتحان میں شامل ہوا۔ امتحان دینے کے بعد خاکسار اپنے گھر بھیرہ آنے سے پہلے چند دنوں کیلئے لاہور ہی میں ٹھہر گیا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ خاکسار نے رؤیاء میں دیکھا کہ

''میں اپنے گھر بھیرہ (واقع محلہ حاجی گلاب) میں ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی لڑکا جو میری جان پہچان کا لگتا ہے، انگریزی کا اخبار لے آیا ہے اور مجھے کہتا ہے، اس اخبار میں بی۔ ایس، سی کا نتیجہ شائع ہوا ہے، تم اپنا نتیجہ دیکھ لو۔ اِس پر میں اخبار ہاتھ میں لے کر نتائج دیکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ نتائج یونیورسٹی کے رول نمبروں کی ترتیب سے دئے گئے تھے۔ میں اپنا رول نمبر (جو مجھے اب تک یاد ہے، ۱۲۹۴ تھا) تلاش کر کے اس کے سامنے لکھے گئے نمبر (پاس مارکس) دیکھتا ہوں تو وہ ۳۳۴ تھے۔ گویا میں اتنے نمبر حاصل کر کے پاس تھا''

اب رؤیاء میں بتائے گئے یہ نمبر اتنے واضح تھے کہ میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ فی الواقعہ اتنے ہی ہونگے۔ اسی خیال سے میں نے کسی کو اپنی یہ رؤیاء نہ بتائی نہ سنائی۔ پھر میں اپنے گھر بھیرہ میں آ گیا اور نتیجے کا انتظار کرنے لگا۔ چونکہ میں نے یہ پرائیویٹ امتحان دیا تھا، اس لئے مجھے یونیورسٹی کی طرف سے براہ راست نتیجہ ملنے کا انتظار تھا۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک دن جب میں گھر پر تھا تو میرے سکول کے زمانے کا ایک کلاس فیلو محبوب الٰہی پراچہ آئے۔ وہ سکول کے زمانے کے بعد مجھے کبھی نہیں ملے تھے تاہم انہیں معلوم تھا کہ میں نے بھی اس سال بی۔ ایس، سی کا امتحان دیا ہے۔ ان کے ہاتھ میں ایک انگریزی اخبار تھا اور مجھے کہنے لگے، اس میں یونیورسٹی کا بی۔ اے، بی۔ ایس، سی کا نتیجہ شائع ہوا ہے۔ میرا نام تو اس میں نہیں ہے۔ آپ اپنا نتیجہ دیکھ لیں۔ چنانچہ میں نے اخبار اس سے لیا اور اپنا رول نمبر تلاش کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بالکل اسی طرح جیسے رؤیاء میں دکھلایا گیا تھا، بریکٹوں کے اندر لکھے ہوئے میرے رول نمبر (1294) کے سامنے بعینہٖ اتنے ہی نمبر لکھے

ہوئے ہیں جو مجھے قریباً ایک ماہ قبل خواب میں دکھائے گئے تھے۔ گویا خدا تعالیٰ کے فضل سے میں پاس تھا۔ میں اسی وقت شکرانے کے نفل پڑھنے لگ گیا۔ والدہ محترمہ کہیں باہر گئی ہوئی تھیں۔ واپس تشریف لائیں تو پوچھا، یہ فضل الٰہی کونسی نماز پڑھ

۱۹۵۱ کا نو وکیشن میں ڈگریاں پانے والے گریجوایٹ جسٹس رحمان اور پرنسپل حضرت مرزا ناصر احمد کے ساتھ

رہا ہے۔ اس پر غالباً بڑی ہمشیرہ، اقبال بیگم صاحبہ مرحومہ، نے بتایا کہ امتحان میں پاس ہونے کی خوشی میں شکرانے کے نفل پڑھ رہا

ہے۔

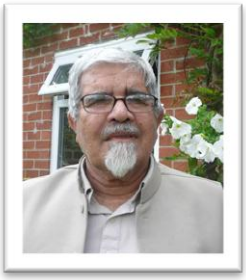

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعلیم الاسلام کالج کی روایتوں کا بیان

ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی برموقع Fund raising dinner مورخہ ۳ نومبر ۲۰۱۲

تعلیم الاسلام کالج محض ایک کالج نہیں تھا اپنی ذات میں ایک روایت تھا جس میں دینی تربیت اور دنیاوی تعلیم کے عناصر آپس میں گندھے ہوئے تھے۔ان کا خمیر اخلاص و محبت ، وضع داری و حمیت ،قربانی و غریب پروری، مساوات و مسابقت، علمیت و روحانیت اور انسانیت و شرافت کے خمیر سے اٹھا تھا۔اس ادارہ کا لائحہ ء عمل یعنی ماٹو علم و عمل تھا۔اس ادارہ میں چھوٹے بڑے اونچے نیچے امیر غریب کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ ہر طالب علم طالب علم تھا اور ہر استاد استاد۔ ہر وجود کو اپنے مرتبہ اور ذمہ داری کا احساس تھا طلباء کو اس بات کا کہ وہ طالب علم ہیں اور ان کی اولیں ترجیح تعلیم ہے اساتذہ کو اس بات کا کہ وہ استاد ہیں اور ان کی اولیں ذمہ داری طلباء کو علم کی روشنی سے منور کرنا ہے اور ان کے تربیتی امور کی نگرانی کرنی ہے۔ غالباً یہ ملک کا پہلا اور آخری ادارہ تھا جہاں کبھی ہڑتال نہیں ہوئی۔ کبھی اساتذہ اور طلبا میں اختلاف نہیں ہؤا حالانکہ عقیدہ کے لحاظ سے اس کالج میں اور خاص طور سے فضل عمر ہاسٹل میں اکثریت ایسے طلبا کی ہوتی تھی جو جماعت کے عقائد سے متفق نہیں تھے۔اس کالج میں کبھی سر پھٹوّل کے واقعات نہیں ہوئے حالانکہ اس کالج میں بھی جذباتی نوجوان پڑھتے تھے اور نوجوانوں میں جھگڑے ہونا نوجوانی میں لابدی ہوتے ہیں۔کالج میں دھڑے بندی بھی نہیں ہوئی حالانکہ اس کالج میں بھی مختلف سوسائٹیوں اور یونین کے انتخابات ہوتے تھے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کالج میں انسان ہی پڑھتے تھے اور انسان ہی پڑھاتے تھے،اور انسان غلطی کا پُتلا ہے۔(ہمارے ایک استاد اسے پتلا پڑھا کرتے تھے)۔ میں اس مضمون میں ان اسباب کا جائزہ لینا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے یہ سب باتیں ممکن ہوئیں۔آپ مجھ سے اختلاف کرنے حق رکھتے ہیں اور میں جو کچھ عرض کرنے جارہا ہوں وہ حرفِ آخر نہیں ہے۔ اس کالج کی بنیاد قادیان جیسے قصبہ میں پڑی جو جماعت احمدیہ کا مرکز تھا۔جس کی فضا میں اخلاص و وفاداری کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔وہاں علم کی بڑی قدر تھی۔ہر عالم کو سر آنکھوں پر جگہ دی جاتی تھی۔ ہمیں یاد ہے قادیان میں فضل عمر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح ہؤا تو ہندوستان کے اس وقت کے مشہور ترین سائنس دان سر شانتی سروپ بھٹناگر تشریف لائے۔ یہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کالج کے ایک بلاک میں قائم کی گئی تھی۔سارا قادیان اس بے پناہ سائنس دان کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑا یوں لگتا تھا جیسے کسی میلہ کا سماں ہے۔ کیوں ؟ صرف اس لئے سر شانتی سروپ سائنس کے میدان میں دنیا بھر کے جانے پہچانے سائنس دان تھے۔اگلے روز سکول میں ہر ساتھی دوسرے ساتھی سے یہی سوال کرتا نظر آیا کہ کیا اس نے سر شانتی سروپ کو دیکھا ہے ؟اس ماحول میں رہنے اور پلنے والے بچے علم کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں تو کیا اس ماحول میں پیدا ہونے اور قائم ہونے والا ادارہ اس جذبہ سے متاثر نہ ہوتا؟اب اس

ادارہ سے فارغ التحصیل طلبا میرے سامنے بیٹھے ہیں کیا آپ نے اپنے ادارہ کو عالموں کی قدر کرتے نہیں دیکھا؟ کیا آپ کے ادارہ میں چوٹی کے سائنسدان، اعلیٰ پایہ کے دینی اور دنیاوی علمائ، مؤرخین، مصنفین، مانے ہوئے ادیب اور مشہور شاعر اور کھلاڑی نہیں آتے رہے اور آپ ان سے مستفیض نہیں ہوتے رہے؟ اور یہ علما صرف علم کے ناطے سے بلائے جاتے رہے ان کا عقیدہ یا ان کی وطنیت اس کا باعث نہیں تھی۔

مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو کہ روس کے سائنس دان ان دنوں ربوہ بلائے گئے اور آئے جن دنوں روس کا نام لینا بھی گناہ تھا۔ مجھے تو اس روسی سائنس دان کی یہ بات بھی یاد ہے کہ " مجھے اس ادارہ کے در و دیوار سے علم دوستی کی خوشبو آرہی ہے"۔ تعلیم الاسلام کالج کے تو نام میں اسلام کا لفظ موجود تھا مگر اس ادارہ نے ایسے ملک کے سائنس دان کی عزت افزائی کی جو خدا کا ہی منکر تھا۔ اور اسی ملک نے خلائی سائنس میں پہلی کامیابی حاصل کی یعنی ہمارا ادارہ علم کے معاملہ میں اتنا فراخ دل تھا اور اسلام کا صحیح پیروکار کہ اسلام کا حکم ہے اطلب العلم ولو کان بالسین ! قادیان میں سرشانتی سروپ بھٹنا گر آتے تھے ربوہ میں روس امریکہ برطانیہ کے سائنس دان اٹلی اور یورپ کے مستشرقین۔ عجیب ادارہ تھا اور عجیب لوگ تھے۔ اور ایسے ملک میں قائم تھا جہاں کے لوگ علم کے معاملہ میں اتنے کوتاہ دست اور تنگ نظر ہو گئے ہیں کہ اپنے نوبیل انعام یافتہ شخص کے وجود کو بھی اپنے تعصب میں تسلیم نہیں کرتے۔ میں آپ کو کیا بتا رہا ہوں؟ یہ کہ تعلیم الاسلام کالج جتنا علم کا اور عالموں کا قدر دان تھا اتنا ہی علم حاصل کرنے والوں کا بھی قدر دان تھا اس قدر دانی سے میں بھی متمتع ہوا اور آپ میں سے ہر کوئی متاثر ہوا ہو گا۔ اس ادارہ کی پہلی روایت علم کی قدر دانی تھی۔ اب میں سامنے کی مثال دیتا ہوں۔ تعلیم الاسلام کالج ایسا ادارہ تھا جس کے نوے فیصد طالب علم کسی نہ کسی طور سے

کالج کے مالی طور پر احسان مند تھے کسی کی آدھی فیس معاف تھی کسی کی پوری فیس معاف تھی کسی کو پانچ روپے وظیفہ ملتا تھا کسی کو دس روپے۔ کسی کا ہاسٹل کا کھانا مفت تھا کسی کو ہاسٹل کی رہائش مفت تھی اور اس رعایت کے لئے کسی کا عقیدہ نہیں پوچھا جاتا تھا۔

پرنسپل صاحب طلبا پر اس درجہ مہربان تھے کہ جرمانہ کرنے والے فراخ دلی سے جرمانے کرتے رہتے تھے اور پرنسپل صاحب اس سے بھی زیادہ فراخ دلی سے جرمانے معاف کر دیتے تھے حتیٰ کہ استاذی المکرم خالد صاحب نے پرنسپل صاحب سے شکوہ کیا کہ ہم جرمانہ کرتے ہیں آپ معاف کر دیتے ہیں اس طرح تو کالج کا انتظام گڑبڑ ہو جائے گا۔ پرنسپل صاحب نے نہایت خوبصورت جواب دیا کہ اگر اللہ میاں نے میرے دل میں طلبا کے لئے رحم ڈالا ہے تو میں ایسا کیوں نہ کروں؟ ہر قسم کی رعایت دینے میں پرنسپل صاحب کی اتنی فراخ دلی دیکھ کر کالج کے ایک مشہور طالب علم نے جو ابھی پچھلے برس رہگزائے بقا ہوئے ہیں ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو درخواست گذاری کہ " میں صبح اٹھنے کا عادی نہیں ہوں اس لئے ازراہ کرم مجھے صبح کی نماز میں حاضری معاف کی جائے" سپرنٹنڈنٹ صاحب نے وہ درخواست پرنسپل صاحب کو بھجوادی۔ پرنسپل صاحب نے ناراض ہونے کی بجائے اس درخواست پر لکھا کہ " میں اللہ رسول کے حکم کی معافی دینے والا کون ہوتا ہوں؟ آئندہ سے احتیاط کروں گا کہ آپ کی نماز سے غیر حاضری کے جرمانے معاف نہ کروں"۔

یہ بات تو بر سبیل تذکرہ سامنے آگئی۔ غریب طلبا کی امداد کرنے کے لئے کالج کی ایک پالیسی تھی وہ یہاں عرض کرتا ہوں۔ پالیسی یہ تھی اگر امتحان میں چھ سو نمبر لینے والے طلبا وظیفہ کا مستحق ٹھہرتے ہیں تو کئی ایسے بھی ذہین طلبا ہوتے ہیں جو پانچ سو ننانوے یا پانچ سو اسی نمبر لیتے ہیں ان کو وظیفہ نہیں ملتا۔ اکثر ایسے ہوتے ہیں جو کالج کی پڑھائی کا سلسلہ جاری ہی نہیں رکھ سکتے۔ کالج ایسے طلبا کو تلاش کر کے انہیں وظیفہ دیتا تھا کہ ان کی پڑھائی میں روک نہ پڑے اگر ایسے اچھے نمبروں والا طالب علم کالج میں آجاتا تھا تو کالج اس کا متکفل ہو جاتا تھا۔ کالج میں صرف نمبر پوچھے جاتے تھے عقیدہ نہیں پوچھا جاتا تھا۔ پھر ہم جیسے نکمے اور غریب طلبا بھی آجاتے تھے جو لاہور یا کسی دوسری جگہ کالج میں داخل ہونے کی مقدرت ہی نہیں رکھتے تھے کالج انہیں بھی سنبھال لیتا تھا وظیفہ دیتا تھا خیال رکھتا تھا ہاں یہ ضرور تھا کہ اگر وظیفہ والے طلبا پڑھائی میں سست گامی دکھاتے تو نقصان اٹھاتے تھے کالج اپنی نوازشات کسی دوسرے ذہین طالب علم کی طرف پھر دیتا تھا اور حق بجانب تھا۔ ایسا ہونا ضرور تھا مگر الشاذ کالمعدوم کے حکم میں تھا یعنی نہ ہونے کے برابر۔ اور یہ جو ہم آج اکٹھے ہوئے ہیں اس کا مقصد اولیں بھی یہی ہے کہ ایسے طلبا کی امداد کے لئے جو ذہانت سے مالا مال ہیں مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے کوئی سبیل کی جائے۔ (صدر صاحب عزیزم ڈاکٹر اعجاز رؤف کی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ ایسوسی ایشن نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس مد میں سولہ ہزار ڈالر یعنی تقریباً پندرہ لاکھ روپیہ اکٹھا کر لیا ہے۔ الحمد

للہ اللھم زد فزد۔)کالج کی دوسری روایت جس کا میں نے ذکر کرنے جارہا ہوں یہ تھی کہ اس ادارہ کا ہر استاد استاد تھا اور ہر طالب علم طالب علم۔ آپ کہیں گے یہ کیا بات ہوئی؟ ہر استاد استاد ہوتا ہے طالب علم طالب علم ہوتا ہے مگر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ دوسرے اداروں میں تو آپ کا استاد صرف وہ ہوتا تھا جس کا مضمون آپ نے پڑھا ہے یا جس نے آپ کو کچھ پڑھایا ہے مگر تعلیم الاسلام کالج میں ایسا نہیں تھا ہر وہ استاد جو آپ کی طالب علمی کے زمانے میں استاد تھا وہ استاد تھا اور آپ طالب علم۔ میں مثال دیتا ہوں اور یہ مثال ہمارے شرفاء کے معاشرہ کی مثال ہے۔ ۱۹۵۵ کی بات ہے میں بزم اردو کا سکرٹری تھا۔ ہمارے پرنسپل حضرت مرزا ناصر احمد نے ایک بار خاص طور سے مجھے بلایا اور فرمایا دیکھو میں کچھ دنوں کے لئے کراچی جارہا ہوں میری غیر حاضری میں میرے گورنمنٹ کالج کے زمانہ کے ایک استاد بزم اردو کی تقریب میں کالج میں آرہے ہیں ان کا خاص خیال رکھنا۔ میں کہا بسر و چشم۔ میں ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے پرنسپل صاحب کے ایک کلاس فیلو سے پوچھا کیا میاں صاحب کالج میں سائنس پڑھتے تھے؟ کہنے لگے نہیں۔ میں چپ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ آپ سائنس تو پڑھتے نہیں تھے یہ کیسی شاگردی ہوئی؟ کسی دوسرے کام کے سلسلہ میں میں پرنسپل کے دفتر میں حاضر تھا۔ پرنسپل کے عزیزوں میں سے ایک طالب علم بھی موجود تھا پرنسپل صاحب اس کو سرزنش فرمارہے تھے " تمہارا یہ کہنا کہ فلاں استاد تمہارا استاد نہیں کہ تم وہ مضمون نہیں پڑھتے بالکل غلط بات ہے جو بھی کالج کے سٹاف پر ہے وہ تمہارا استاد ہے اور لائق احترام۔ تم اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتے۔ ابھی جاؤ اور اپنے استاد سے معافی مانگ کر آؤ۔" وہ طالب علم سائنس کا طالب علم تھا اور جس استاد کا ذکر درمیان میں تھا وہ آرٹس کے کسی مضمون کے استاد تھے۔ کالج کی اس روایت کا میں اس لئے بھی بیان کر رہا ہوں کہ اب زمانہ بدل گیا ہے ہمارے ہاں کی پرانی روایتیں پرانی سمجھ کر بھلائی جارہی ہیں کچھ مغربی معاشرہ کا اثر ہے مگر تعلیم الاسلام کالج کے طلبا کو یہ روایت یاد رکھنی چاہئیے۔ علی گڑھ مسلم کالج کی روایت بھی ایسی ہی تھی کہ اگر کسی علیگ کو مدتوں بعد کوئی ایسا استاد مل جاتا جو اس کے زمانہ یا کسی زمانے میں علی گڑھ کالج سے وابستہ رہا ہوتا تو وہ لوگ ان کے سامنے بچھ بچھ جاتے کہ یہ علی گڑھ کا استاد ہے اور ہم علی گڑھ کے طالب علم رہے ہیں۔ ہم تو اب تک کسی ایسے استاد کو جو ہماری طالب علمی کے زمانہ میں استاد تھا استاد ہی کہتے اور سمجھتے ہیں اور اس میں اس استاد کی کوئی عزت افزائی نہیں خود اپنی عزت افزائی ہے۔ استاذی المحترم چوہدری محمد علی صاحب کو استاذی المحترم کہنے سے ان کی عزت نہیں بڑھتی خود ہماری عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ استاذی المکرم مبارک احمد انصاری یہاں تشریف فرما ہیں انہیں استاذی المکرم کہنا ان کے لئے نہیں ہمارے لئے باعث شرف ہے۔ نئے لوگوں کے لئے ایک بات کہہ دوں جب میں اورینٹل کالج میں پڑھتا تھا تو برصغیر کے نامور عربی عالم علامہ عبدالعزیز میمنی لاہور تشریف لائے۔ ہمارے پرنسپل ڈاکٹر سید عبداللہ نے طلبا سے ان کا تعارف

کرواتے ہوئے کہا بچو آج علامہ عبدالعزیز میمنی سے مل لو کل اس بات پر فخر کیا کرو گے کہ ہم علامہ عبدالعزیز میمنی سے ملے ہیں اور ان کے ارشادات سنے ہیں۔اب اسی قبیل کی ایک بات کہ استاذی المحترم چوہدری محمد علی صاحب جب پہلی بار سجاد ملک کے بلانے پر کینیڈا تشریف لائے تو وینکوور سے کالج کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے والا پاکستان پولیس باسکٹ بال ٹیم کا ایک عیسائی کھلاڑی والیس (جسے عرف عام میں والی کہا جاتا تھا) اپنے بیٹے کو لے کر خاص طور پر ٹورنٹو آیا اور اپنے بیٹے کو چوہدری صاحب سے ملوایا۔ کہنے لگا بیٹے ان سے مل لو اور ان کی باتیں سن لو عمر بھر فخر کرتے رہو گے کہ میں نے چوہدری محمد علی صاحب کو دیکھا ہوا ہے۔دور جانے کی ضرورت نہیں یہاں کہیں ٹورنٹو میں ہی باسکٹ بال کا نامور کھلاڑی خالد تاج رہتا ہے جو جماعت احمدیہ سے وابستہ نہیں۔ چوہدری صاحب کے یہاں آنے پر جس بے قراری اور محبت سے وہ ان کے گرد گھومتا رہا کیا کوئی چاہنے والا اپنے محبوب کے گرد گھومے گا۔اے کاش اسے اس مجلس میں بلایا گیا ہوتا تو وہ سر کے بل آتا (میں دیکھ رہا ہوں کہ عزیزی ڈاکٹر خالد تاج یہاں اس محفل میں موجود ہیں اللہ انہیں خوش رکھے)۔ میں نے کہا نا کالج میں کبھی ہڑتال نہیں ہوئی اور میں اس زمانہ کی بات کر رہا ہوں جب کالج کالج تھا۔ایک بار صبح صبح اطلاع ملی کہ چنیوٹ کالج میں کسی مسئلہ پر ہڑتال ہو گئی ہے اور چنیوٹ کے طلبا ربوہ کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں کہ یہاں کا کالج بھی بند کروا کر دم لیں گے۔ ہمیں یاد ہے اس روز استاذی المحترم میاں عطاء الرحمٰن پرنسپل کے طور پر کام کر رہے تھے۔پرانے طلباء جانتے ہیں کہ ہمارا پہلا پیریڈ ہوتا تھا اور ہال میں ہوتا تھا اس انبوہ کثیر کی وجہ یہ تھی کہ اردو لازمی مضمون تھا اور ہر طالب علم کو بادل ناخواستہ پڑھنا پڑتا تھا۔(جملہ معترضہ ہے ہمارے امیر صاحب اس وقت کالج کے طالب علم تھے اور اس بات پر ہر وقت اللہ کا شکر ادا کیا کرتے ہیں کہ اس وقت اردو لازمی مضمون نہیں تھا ورنہ ہماری شاگردی کی تہمت ان پر بھی لگ جاتی۔ویسے تو ہم بھی اس حسن اتفاق پر اللہ کا شکر ادا کیا کرتے ہیں مگر اس کی وجہ کوئی اور ہے) ابھی فرسٹ ائیر کا پہلا پیریڈ ختم ہونے میں چند منٹ تھے کہ قبلہ میاں عطاء الرحمٰن صاحب نے ہمیں متوجہ کر کے باہر بلایا اور فرمایا کہ اپنا پیریڈ جاری رکھیں دوسری کلاس بھی ساتھ ہی شامل کر لیں۔اتنے میں سیکنڈ ائیر کے طلباء کا جم غفیر بھی آ گیا اور ہال میں سما گیا ہماری کلاس جاری رہی۔ہم نے نصاب کی کتاب تہ کر کے رکھ دی اور جدید تر شاعروں کے خوب صورت شعر سنانا شروع کر دئے اور ہال واہ واہ سبحان اللہ کے نعروں سے گونجتا رہا۔۔کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد قبلہ میاں صاحب نے پیغام بھجوایا کہ اب کلاس چھوڑ دیں۔ ہم نے ساڑھے سات سو لڑکوں کو ڈیڑھ گھنٹے تک کلاس میں پابند رکھا کوئی ہلہ گلہ ہوا نہ کسی کو احساس ہوا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو گیا ہے۔چوتھے پیریڈ کے بعد کالج کا کام معمول کے مطابق چلنے لگا۔تب معلوم ہوا کہ اے سی نے چنیوٹ کالج کی ہڑتال کی خبر سن کر کالج والوں کو متنبہ کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر ضرورت ہو تو وہ پولیس کا انتظام کرنے کو تیار ہیں مگر کالج انتظامیہ نے کہا کوئی ضرورت

نہیں ہمیں اپنے طلبا پر اعتماد ہے۔ ہم خود طلباء کو سنبھال لیں گے اور سنبھال لیا۔ یہ بات کہنے کی مجھے ضرورت نہیں کہ اس وقت چنیوٹ کے بیسیوں طالب علم کالج میں پڑھتے تھے اور کلاسوں میں موجود تھے۔ اور پولیس کالج کے احاطہ میں قدم رکھنے کی جرات نہیں کرتی تھی۔ ہمارے کالج کا ماحول ہی ایسا تھا کہ طلبا کو بھول کر بھی کسی ہڑتال وڑتال کا خیال نہیں آتا تھا۔ یہاں ایک اور واقعہ سنا دوں۔ چنیوٹ کے اے سی میرے عزیز دوست جاوید محمود صاحب تھے جو بعد کو چیف سکرٹری ہو کر ریٹائر ہوئے۔ میں کسی کام سے انہیں ملنے کو گیا۔ اس وقت ان کی عدالت میں کم و بیش دس ایسے وکلا موجود تھے جو تعلیم الاسلام کالج میں میرے شاگرد رہ چکے تھے۔ میں عدالت میں داخل ہؤا تو ایک کھلبلی سی پڑ گئی۔ وکلا تعظیماً ایک طرف ہو گئے اور نہایت احترام سے مجھے آگے آجانے کا کہنے لگے۔ جاوید محمود چونک کر کھڑے ہو گئے عدالت برخواست کر دی اور مجھے اپنے پرائیویٹ کمرہ میں بلا لیا کہنے لگے چنیوٹ کے وکلاء آپ کے نیاز مند لگتے ہیں۔ میں نے کہا یہ سب میرے شاگرد ہیں اور ربوہ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ چنیوٹ کا ہر پڑھا لکھا آدمی ربوہ کا پڑھا ہؤا ہے۔ اور ہر ان پڑھ مولویوں کا پڑھایا ہؤا ہے۔ پھر آپ سب جانتے ہیں کہ کالج روئنگ میں اور باسکٹ بال میں ملک بھر میں جانا پہچانا تھا۔ روئنگ کے انچارج چوہدری محمد علی صاحب ہوتے تھے پھر برادرم چوہدری حمید احمد ہو گئے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ہمارے پروفیسر محمد اسلم صابر بھی روئنگ کے انچارج رہے۔ روئنگ میں بڑے بڑے تنومند کھلاڑی ہوتے تھے صحت مند توانا اور قوی الجثہ۔ یہاں ناصر احمد ظفر کہیں موجود ہوں گے ہاں دیکھئے وہ بیٹھے ہیں۔

روئنگ کے کھلاڑی پرنسپل صاحب کے بڑے قریبی " رشتہ دار" کہلاتے تھے وہ انہیں خوب حلوے اور دودھ اور سویابین کھلا کھلا کر پالتے تھے بعض کھلاڑی توڈنڈے بھی کھا کر بے مزا نہیں ہوتے تھے یہ روئنگ والے کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتے تھے آخر کئی سالوں کے چیمپئن جو تھے۔ پھر عربی روئنگ کو کھا گئی۔ قفٰی نبک من ذکریٰ حبیب و منزل۔ اس عربی مصرعہ کا مطلب کھانے کے بعد اسلم صابر صاحب سے پوچھ لیجئے گا۔ اور ہاں ان پروفیسر محمد اسلم صابر صاحب کو معمولی آدمی نہ سمجھئے۔ یہ تاریخی آدمی ہیں۔ تاریخ احمدیت میں ان کا ذکر ہے۔ ۱۹۵۴ میں جب تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی عمارت کا افتتاح ہوا تو حضرت خلیفتہ المسیح الثانیؓ افتتاح کے لئے تشریف لائے۔ اس وقت افتتاحی اجلاس میں حضرت خلیفتہ المسیح الثانیؓ کی موجودگی میں فرسٹ ائیر کے ایک طالب علم نے حضرت اقدس مسیح موعودؑ کی ایک دعائیہ نظم ترنم سے پڑھی وہ طالب علم محمد اسلم صابر تھے۔ ربوہ کی مسجد مہدی میں دہشت پسندی کے ۱۹۹۶ والے واقعہ میں زخمی ہونے اور " زندہ شہید" کہلانے کا تاریخی اعزاز انہیں بعد کو نصیب ہوا۔ پھر باسکٹ بال کا کھیل اپنے ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے شروع کیا اور انتہا تک پہنچایا۔ کالج کے کھلاڑی پنجاب کی ٹیم بنکوں کی ٹیموں آرمی کی ٹیموں میں نمایاں گنے جانے لگے ربوہ باسکٹ بال کا مرکز بن گیا۔ نصیر خاں صاحب کے بعد چوہدری محمد علی صاحب باسکٹ بال کے نگران بنے ان کے پرنسپل بن جانے کے بعد نوبت بایں جارسید کہ ہم جیسے باسکٹ بال کے " آؤٹ سٹینڈنگ کھلاڑی" بھی باسکٹ بال کھلانے لگے۔ اس تلمیح کا بیان یوں ہے کہ دسویں قومی باسکٹ بال چیمپئن شپ کا میزبان

سرگودھا ڈویژن کی جانب سے ناصر باسکٹ کلب اور کالج تھا۔ ہمارے ڈویژن کے کمشنر سید قاسم رضوی مرحوم بہ حیثیت کمشنر اس ٹورنامنٹ کے نگران تھے اور میں کالج کے ناصر باسکٹ بال کلب کا نگران ہونے کی وجہ سے منتظم۔ انتظامات کا معائینہ کرنے آئے تو برسبیل تذکرہ مجھ سے پوچھنے لگے ڈاکٹر صاحب کیا آپ بھی باسکٹ بال کے کھلاڑی رہے ہیں؟ میں نے کہا

'' جی سر! آؤٹ سٹینڈنگ کھلاڑی! وہ جو باہر کھڑے ہوتے ہیں۔'' یہ تو کالج کے نام کی برکت تھی کہ ربوہ کا نام باسکٹ بال کے قومی حلقوں میں نمایاں رہا۔ کالج کی ایک روایت کھیل اور کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی بھی تھی۔ کالج کی ہاکی، فٹ بال کی ٹیمیں بھی نمایاں تھیں اور ان ٹیموں کے کئی گھٹنوں سے معذور طالب یہاں بیٹھے ہوں گے۔ زکریا ورک صاحب تو فٹ بال کی ٹیم کی تاریخی تصویریں بھی سنبھالے بیٹھے ہیں اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو عبرت دلاتے رہتے ہیں۔ اور ابھی چند ہفتے پہلے ہماری ہاکی ٹیم کا نمایاں ترین کھلاڑی ماجد شاہد یہاں آیا ہے اور بچارا ہاکی سٹک کی بجائے واکنگ سٹک پکڑے پھرتا ہے۔ اور ہمارے کرنل راجہ اسلم کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے۔ آپ ماشاءاللہ پول والٹ کے کھلاڑی تھے اور کالج کے بلکہ یونیورسٹی کے چیمپین۔ فوج میں توپ خانہ میں رہے وہاں ان کا پول والٹ کا تجربہ بہت کام آیا ہوگا کہ توپ نہ چلی تو گولہ کو پولٹ والٹ والے پول سے باندھ کر سرحد کے پار اچھال دیا۔ یہ سابق صدر پرویز مشرف توپخانہ سکول میں ان کے شاگرد رہے یہاں آئے تو راجہ صاحب سے بہت احترام سے سر کہہ کر ملے اور توپ خانے کی ٹریننگ کا ذکر کرتے رہے۔ روایتوں کا ذکر ہو رہا ہے ہماری ایک روایت یہ تھی کہ کالج میں تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ زائد از نصاب سرگرمیاں سارا سال جاری رہتیں۔ کبھی مباحثے ہو رہے ہیں کبھی مشاعرے کبھی کوئی عالم تقریر کو آرہا ہے کبھی کوئی۔ کہیں مجلس ارشاد کے اجلاس ہیں کہیں یونین کے جلسے۔ غرض کوئی ہی ایسی شام تھی جو فارغ گذرتی ہو کوئی نہ کوئی ادبی یا علمی ہنگامہ برپا رہتا۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ طلبا کی دلچسپی کا اور کوئی سامان شہر میں میسر نہیں تھا اور دوسری اور بڑی وجہ یہ تھی کہ طلباء کو زائد از نصاب سرگرمیوں میں مصروف رکھنا اساتذہ کے فرائض میں شامل تھا۔ دوسرے شہروں میں لوگ شاگردوں کو ٹیوشنوں میں مصروف رکھتے تھے ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں تھا۔ غریب اور کمزور طلباء کو اساتذہ تیاری کروا دیتے تھے بعض '' امراء'' ٹیوشن بھی پڑھتے تھے مگر ان کی نسبت کالج کے طلبا کی تعداد کی نسبت سے بہت کم تھی۔ انگریزی اور سائنس کے مضامین میں البتہ بعض طلبا ٹیوشن ضرور رکھتے تھے مگر وہ عالم نہیں تھا کہ اساتذہ کالج میں تو پڑھاتے نہ ہوں اور گھروں پر ٹیوشن کی فیکٹریاں چلا رکھی ہوں۔ ہم ٹیوشن کے خلاف نہیں کیونکہ اس ٹیوشن ہی کی بہ دولت ہم ایم اے کرنے کے قابل ہوئے مگر کالج کے سٹاف پر آجانے کے بعد ہم نے کبھی کوئی ٹیوشن نہیں پڑھائی۔ جس کو پڑھایا اور کئیوں کو پڑھایا بغیر کسی معاوضہ کے پڑھایا۔ ہمارے اساتذہ از بسکہ انجمن سے گذارہ الاؤنس پانے والے لوگ تھے اشد ضرورت کے وقت ٹیوشن پڑھاتے بھی ہوں گے مگر اس ٹیوشن پر انحصار ان کا وطیرہ نہیں تھا۔ وہ علم پھیلاتے تھے بیچتے نہیں تھے۔ ہمارے کالج کے اساتذہ کے پاس وقت نہیں تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اکثر اساتذہ کالج کے علاوہ جماعتی تنظیموں میں کام کرتے تھے۔ انصار اور خدام کی مرکزی تنظیموں کا رضاکارانہ کام ہمارے اساتذہ نے سنبھالا ہوا تھا۔ استاذی المحترم محبوب عالم

خالد تو انصار اللہ کے معتمد عمومی تھے جو انصار اللہ کا سب سے بڑا تنظیمی عہدہ ہے۔ پروفیسر حبیب اللہ خاں مدتوں انصار اللہ کے قائد مال رہے اپنے چوہدری حمید اللہ صاحب تو سارا سال جلسہ سالانہ کا کام کرتے تھے۔ رشید غنی مرحوم بھی خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ میں خوب کام کرتے تھے پھر وہ وقت بھی آیا اور جو بات میں کہنے جارہا ہوں وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ حضرت پرنسپل صاحب صدر انجمن احمدیہ کے صدر مقرر ہوئے تو خالد صاحب ان کے ہمراہ صدر کے معتمد کے طور پر انجمن میں چلے گئے اور کالج میں اردو کی کلاسیں ایک طالب علم کے سپرد کر گئے وہ طالب علم میں تھا۔ میں سال چہارم کا طالب علم تھا اور اپنی کلاس کے علاوہ تھرڈ ائیر سیکنڈ ائیر کے طلباء کو بھی اردو پڑھاتا تھا۔ اس زمانہ کے ایک طالب علم ایک تو ہمارے ماسٹر حبیب صاحب ہیں جو اکثر جمعہ پر ملتے ہیں تو فرماتے ہیں میں اسی برس کا ہو گیا ہوں میں انہیں کہتا ہوں آپ سو برس کے بھی ہو جائیں تو رہیں گے تو میرے شاگرد نا۔ فرماتے ہیں ہاں یہ بات تو درست ہے۔ (اس بد نصیبی سے تو چھٹکارا نہیں) اسی طرح ایک بار عزیزی نسیم مہدی وینکوور یا کیلگری گیا تو وہاں انہیں ایک نہایت بڈھا کھوسٹ آدمی ملنے آیا۔ کہنے لگا میں پروازی صاحب کا شاگرد ہوں اور میں نے ان سے اس زمانہ میں پڑھا ہے جب وہ خود طالب علم ہوتے تھے۔ اس کا نام غلام رسول آشنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے کر واپس لائے افریقہ میں پڑھانے گیا تھا کہ وہاں ٹھوکر لگ گئی۔ کالج میں اساتذہ اور طلبا کے مابین ایک محبت کا رشتہ قائم تھا اس محبت اور بے تکلفی کے اظہار کے لئے ہاسٹل کے سالانہ فنکشن میں ایک رات طلبا کو کھلی چھٹی دی جاتی تھی کہ وہ تہذیب کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے اساتذہ کے بارے میں اپنے اصلی

جذبات کا اظہار کر لیں چنانچہ مختلف اساتذہ طلباء کی تنقید کا نشانہ بنتے قبلہ چوہدری محمد علی صاحب تنہا رہنے کی وجہ سے قبلہ صوفی صاحب جرمانوں کی وجہ سے حمید اللہ صاحب اپنی کم آمیزی کی وجہ سے نصیر خاں صاحب کالج یونین کا انچارج ہونے کے ناتے

اور ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد صاحب اپنی سائنس کی درسی کتابوں کی وجہ سے سعید اللہ خاں صاحب اپنی مرغیوں اور انڈوں کی وجہ سے اور حضرت پرنسپل صاحب اپنی کھڑ کھڑاتی کار کی وجہ سے۔ کھڑ کھڑ کر دی بوئے اگوں لنگدی ساڈے سجناں دی کار اے

کالے رنگ دی۔ جب اس کار کا قصیدہ زیادہ ہی پڑھا جانے لگا تو قبلہ چوہدری محمد علی صاحب کو گماں گذرا کہ طلبا پرنسپل کی کار سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہونے لگے ہیں تو انہوں نے حکم دیا کہ اب کے سالانہ فنکشن میں پرنسپل صاحب کی کار کے بارے میں کوئی آئیٹم نہیں ہوگا۔ از بسکہ یہ تمام کارروائی خفیہ رکھی جاتی تھی مگر پرنسپل صاحب کو کہیں سے بھنک پڑ گئی کہ اب کے ان کی چہیتی کار کی خوبصورتی اور حسن و جمال اور خوش خرامی کا تذکرہ ممنوع کر دیا گیا ہے تو آپ نے چوہدری محمد علی صاحب کو پیغام بھیجا کہ اگر سالانہ فنکشن میں ان کی کار کا تذکرہ نہیں ہوگا تو وہ اس فنکشن میں نہیں آئیں گے۔ چنانچہ حسب معمول اس سال بھی

پرنسپل صاحب کی چہیتی کار طلبا کی پھبتیوں کا تختۂ مشق بنی۔ اس کے بعد تو پرنسپل صاحب خلافت کے مرتبہ پر سرفراز ہو گئے پھر ان کی کار کو کون کچھ کہتا؟ وہ کار سنا ہے قصر خلافت کے گیراج میں کھڑی کھڑی اسی غم میں گھُل گھُل کر گل گئی کہ اب مجھ پر کوئی پھبتی بھی نہیں کہتا۔ تھی وہ اک شخص کے تصور سے۔ اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں؟ اگر آپ نے میری معروضات کو از راہ مجبوری سنا ہے جیسے اردو لازمی ہونے کی وجہ سے سنا کرتے تھے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اور اگر آپ نے دلچسپی سے سماعت فرمایا ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آمین۔

ایک یادگار تصویر

کانووکیشن ۱۹۶۱ پر کالج سٹاف پروفیسر سراج الدین ایجوکیشن سیکٹری پنجاب کے ساتھ

حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمدؒ صاحب پرنسپل ٹی آئی کالج کی عنایات

کریمانہ کی چند جھلکیاں

مٹ چکے ذہن سے سب یاد گذشتہ کے نقوش پھر بھی اک یاد ہے ایسی کہ فراموش نہیں

از قلم منیر احمد باجوہ ہیمبرگ جرمنی

استاذی المکرم پروفیسر حمید احمد چوہدری صاحب صدر ٹی آئی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن جرمنی نے خاکسار کی ایک ای میل کے جواب میں ہمارے بانی پرنسپل صاحب کے متعلق ایک نہائت ہی خوبصورت جملہ تحریر فرمایا تھا the great Principal who nourished the college as his own child کہ انہوں نے کالج کو اسطرح پروان چڑھایا۔ جیسے خوراک دیکر اپنے بچے کی پرورش کی جاتی ہے۔ اس جملے میں لفظ Nourish کے حوالہ سے اس عظیم ہستی کے متعلق میری یادوں کے دریچے کھلنے لگے اور مجھے ۶۰۔۱۹۵۹ کا وہ زمانہ یاد آگیا جب ہمارے والدین نے ہمیں دور افتادہ ایک گاؤں سے اٹھا کر ربوہ جیسی مقدس بستی میں آباد کیا۔ ٹی آئی ہائی سکول میں چھٹی جماعت میں داخل ہوئے اور بورڈنگ ہاؤس میں ہماری کلاس شروع ہوئی۔ میاں محمد ابراہیم جمونی صاحب ہیڈ ماسٹر تھے ان کا جسم تو دُبلا پتلا تھا لیکن اُنکے رعب سے تمام طالبعلم لرز جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ربوہ میں کالی آندھیوں کے تیز جھکڑ چلتے تھے۔ (کابلی) کیکر کے درخت ہر طرف پائے جاتے تھے اور اُنکے میخ نما کانٹوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اگر یہ ہڈی میں دھنس جائے تو ہڈی تو ٹوٹ سکتی ہے لیکن یہ کانٹا نہیں ٹوٹے گا۔ ربوہ کا پانی بہت کڑوا ہوتا تھا خاص طور پر بورڈنگ کے نلکا کا نقشہ ابھی تک میری نگاہوں کے سامنے ہے جب پانی کی کڑواہٹ اور تیزابیت سے نلکے کا لوہا بھی گل کر گرتا رہتا تھا۔ ایک دن کلاس روم میں ہمیں بتایا گیا کہ آج

کالج کے پرنسپل صاحب سکول کا معائنہ کرنے کیلئے تشریف لا رہے ہیں اور وہ آپکی کلاس میں بھی آئیں گے۔ جمونی صاحب کا ہی رُعب ہماری بساط سے کہیں بالا تھا اوپر سے محترم پرنسپل صاحب کی آمد کا سنا تو ہم سہم کے رہ گئے طرح طرح کے وسوسے ذہن میں جنم لینے لگے کہ نہ جانے وہ ہم سے کیا کیا سوال پوچھیں گے ؟ ہماری تو ان کے سامنے بولنے کی بھی ہمت نہیں ہم جواب کیا دینگے۔ بار بار ہمیں ہدایات دی جارہی تھیں کہ جب وہ آئیں تو مکمل خاموشی ہو اور آپکی طرف سے کوئی شور نہ ہو اُدھر مارے ادب کے ہمیں سانس تک نہیں آرہی تھی ہماری طرف سے شور کیا ہونا تھا۔ ؟ کلاس روم میں ایک سناٹا طاری تھا کہ محترم جمونی صاحب کے ساتھ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصرؒ احمد صاحب پرنسپل ٹی آئی کالج ہمارے کمرہ میں تشریف لائے اُس وقت آپکے چہرہ مبارک پر پڑنے والی زندگی میں یہ میری پہلی نظر تھی۔ انہوں نے کھڑے کھڑے ہی ہمارے سہمے ہوئے چہروں پر نظر ڈالی اور جمونی صاحب کے ساتھ قدرے ہمکلام ہوئے۔ جو ہمیں سنائی نہ دیا۔ آپکے کمرہ میں آتے ہی ہماری بے چینی کی کیفیت قدرے سنبھلنے لگی اور آہستہ آہستہ سکینت میں تبدیل ہونے لگی، دل بجائے خوف کے اُن کی طرف رغبت کے ساتھ لپکنے لگا۔ اندر ہی اندر شادمانی کی شہنائیاں سی بجنے لگیں آپکی زیارت نے ہمارے اندرون کو چند لمحوں میں ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ دل نے چاہا کہ آپ ابھی اور ہمارے پاس رکے رہیں اور ہم آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی اپنے میں ہمت پیدا کر سکیں لیکن آپ کی مقدس مقناطیسی شخصیت کے آگے ہماری بھلا کیا اوقات۔۔؟ آبادگی کا نور غزل خواں تھا آنکھ میں فرطِ حیا سے لب پہ تھے تالے پڑے ہوئے آپکے لباس اور پاکیزہ وجود سے بھینی بھینی نہائت ہی پیاری خوشبو آرہی تھی جس سے آپکے ارد گرد کا سارا ماحول معطر ہو گیا۔ وہ چند لمحے پلک جھپکتے ہی گزر گئے اور آپ واپس تشریف لے گئے۔ آپکے جانے سے دل اداس اور ماحول افسردہ ہو گیا۔ خاموشی اُسی طرح ہی طاری رہی جیسے آپکے آنے سے قبل رُعب اور دبدبہ کی وجہ سے تھی اب آپکے جانے کے بعد اُداسی کیوجہ سے طاری رہی۔ یہ نصف صدی پہلے کی بات ہے لیکن ۔ میرا دل جانتا ہے دونوں منظر میں نے دیکھے ہیں تیرے آنے پہ کیا گزری تیرے جانے پہ کیا گزری ابھی تھوڑا وقت ہی گزرا ہو گا کہ ایک استاد محترم تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ میں آپکے لئے ایک خوشی کی خبر لایا ہوں۔ محترم پرنسپل صاحب نے فرمایا ہے کہ اُنکی طرف سے ہر بچے کو آج آدھ آدھ سیر دودھ پلایا جائے۔ لہٰذا آپ ٹک شاپ میں چلیں اور جاکر دودھ پئیں۔ آپکی اس عنائت کریمانہ سے اُسوقت جو ہماری کیفیت ہوئی اسکو اے کاش ! میں لفظوں میں بیان کر سکتا، آپکی اس شفقت اور کشش نے ہماری دنیا ہی بدل دی۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ روز اول سے ہی آپکی Nourishment نصیب ہوئی۔

اس کے بعد میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہوئے اور فٹ بال کی ٹیم میں باقاعدہ پریکٹس شروع کی تو پرنسپل صاحب کیطرف سے یہ نوید سنائی گئی کہ تمام کھلاڑیوں کو پریکٹس کے بعد روزانہ ٹک شاپ میں آدھ آدھ سیر دودھ پلایا جائے۔ بخوفِ طوالت میں اسے مختصر کرتا ہوں کہ عرصہ چار سال کالج میں گزرا اور اس سارے عرصہ میں مسلسل آپکی یہ Nourishment نصیب ہوتی رہی۔ ضمناً عرض کر دوں کہ صرف اپنے ہی نہیں بیگانے بھی آپکی اس شفقت سے فیض پاتے رہے ہیں۔ آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ ربوہ میں آپؒ نے دیکھا کہ پولیس کی ٹیم کا ایک اُدھیڑ عمر کھلاڑی المعروف پاہیا (بھائیا) اپنی طرف سے بڑی جان مار رہا ہے لیکن تفاوت عمری کیوجہ سے اُس سے کچھ بن نہیں پڑ رہا تو میچ کے معاً بعد آپؒ نے اعلان فرمایا کہ پاہیا کو میری طرف سے سویا بین دی جائے۔ نہ جانے آپؒ کے مہربان دل نے کسطرح میچ کے اختتام تک کا انتظار فرمایا جو ضرورت مندوں کی Nourishment کیلئے آنِ واحد میں تڑپ جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تاج خلافت آپکے مبارک سر پر سجایا۔ تو خلافت کے ابتدائی ایام میں آپؒ نے ارشاد فرمایا کہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کسی احمدی کا ہمسایہ رات کو بھوکا نہ سوئے۔ کوئی سوال نہیں تھا کہ ہمسایہ کون ہے یا اُسکا مذہب کیا ہے ؟ ۷۲۔۱۹۷۳ کا زمانہ آیا جب آپؒ کے ارشاد پر ربوہ میں گھوڑ دوڑ اور نیزہ بازی کا ٹورنامنٹ شروع ہوا۔ آپؒ نے اِس کلب کا نام الخیلِ للرحمٰن عنائت فرمایا۔ ہم نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ تمام گھوڑ سواروں میں سب سے کم عمر گھوڑ سوار اخویم عزیزی نصیر احمد باجوہ تھا۔ جسے اُسکی کم عمری کیوجہ سے سب ''چھوٹو رام،، کہتے تھے۔ نیزہ بازی میں ہماری سیکشن اول انعام کی حقدار قرار پائی۔ حضورؒ نے اپنے دست مبارک سے ہمیں انعامات سے نوازا۔ اُس کے بعد حضورؒ نے ہمیں عوامی میلہ پنجاب لاہور میں شرکت کرنے کا ارشاد فرمایا۔ اس میلہ کا پہلے نام Horse and Cattle Show ہوا کرتا تھا بھٹو دور میں اس کا نام عوامی میلہ رکھا گیا۔ یہ فورٹریس سٹیڈیم لاہور میں منعقد ہوتا تھا۔ اُن دنوں صدر خدام الاحمدیہ مرکزیہ مکرم مولانا عطاء المجیب راشد صاحب تھے اور اس میلہ کیلئے ہمارے نگران اعلیٰ صاحبزادہ مرزا لقمان احمد صاحب مقرر ہوئے جنکی نگرانی میں چار ٹرکوں پر سولہ گھوڑے لیکر ہم ربوہ سے لاہور پہنچے اور ربوہ رائیڈنگ کلب آف پاکستان کے نام پر اپنی کلب کی رجسٹریشن کروائی۔ فورٹریس سٹیڈیم سے ملحقہ ایک حصہ میں ہمارا پڑاؤ تھا۔ ہمارے قیام وطعام کے الگ انچارج مقرر تھے جو بہت ہی مخلص جوان تقویٰ شعار اور دیانتدار عالمِ دین تھے۔ وہاں پر ہمارا قیام کم و بیش پندرہ دن تک رہا۔ (تصاویر اس ویب سائٹ پر موجود ہیں) ہمارے جانے کے چار پانچ دن کے بعد حضور اقدسؒ اپنے ہی پروگرام کے مطابق نہ کہ اس میلہ کیلئے لاہور تشریف لائے۔ ہم تمام گھوڑ سواروں کی یہ خوش قسمتی تھی۔ ہم آپؒ کی آمد کی اطلاع پاتے ہی سٹیڈیم سے آپکی رہائش گاہ پر حاضر خدمت

ہوئے۔ حضور اقدسؒ نے کوٹھی کے سبزہ زار میں ٹینٹ لگوایا ہوا تھا ازراہ شفقت حضورؒ اس میں تشریف لائے اور ہمیں بہت وقت دیا۔۔۔ بہت پیار دیا۔ اور ہمیں اپنے ساتھ تصویر بنوانے کا بھی عزاز عطا فرمایا۔

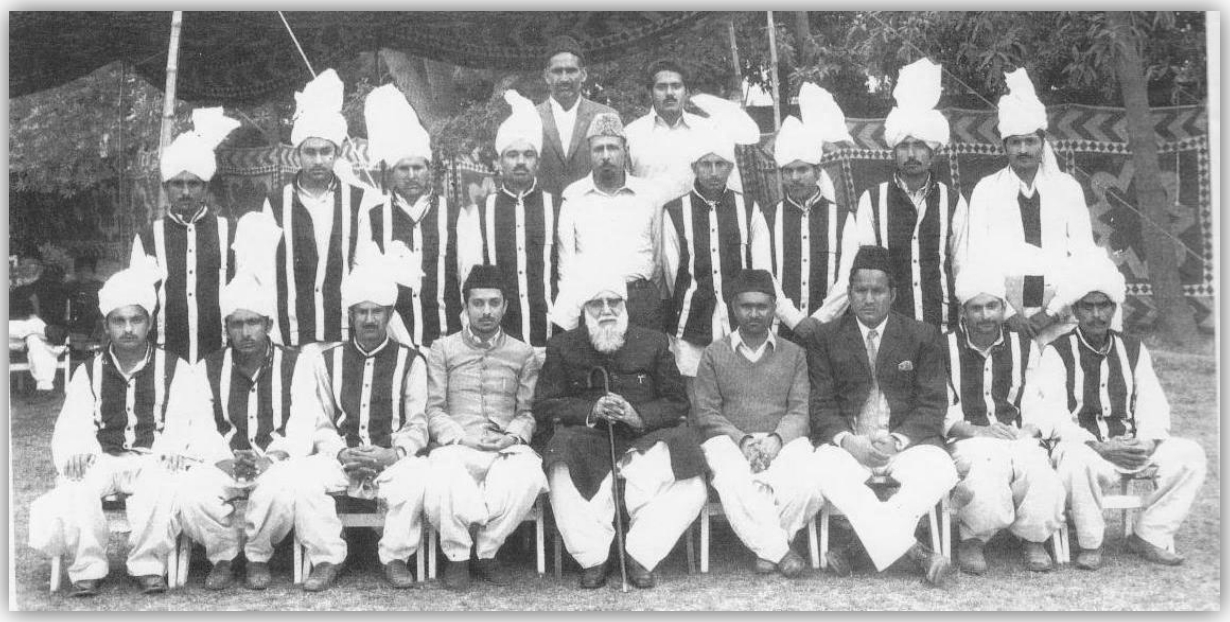

حضورؒ نے از خود ہی اندازہ لگا رکھا تھا کہ جتنے پیسے گھوڑ سواروں کے قیام وطعام کیلئے ہمارے انچارج کو دئے گئے تھے وہ تو اب تک خرچ ہو چکے ہونگے اس لئے حضورؒ نے ازراہ شفقت از خود اپنی جیب سے کچھ روپے نکالے اور ہمارے انچارج صاحب کیطرف بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ آپکے پاس پیسے خرچ ہو چکے ہونگے یہ رقم اخراجات کیلئے رکھ لو۔ ہمارے انچارج صاحب نے عرض کیا کہ حضور ابھی تو پہلی رقم ہی آدھی سے زیادہ میرے پاس بچی ہوئی ہے۔ یہ سنتے ہی حضورؒ اقدس کے چہرہ کی رنگت تبدیل ہو گئی اور فرمایا کہ فی الفور چارج چھوڑ دو بس پکڑو اور ابھی واپس ربوہ چلے جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وجہ یہ بنی کہ اتنے دنوں سے یہ گھوڑ سوار یہاں آئے ہوئے ہیں اور انکا خیال رکھنے کی بجائے اتنا ہاتھ کھینچ کر رکھا ہوا ہے۔۔۔ حالانکہ ہمیں احساس تک بھی نہیں تھا کہ ہم پر خرچ کم ہو رہا ہے یا خرچ زیادہ ہونا چاہئے تھا۔ نہ ہی کسی نے کوئی شکائت کی۔ اور وہ انچارج صاحب بھی پوری دیانتداری کے ساتھ ہمہ وقت خدمت کر رہے تھے۔ اور آج تک وہ جماعت کے اعلیٰ عہدوں پر فائزرہ کر خدمت بجالا رہے ہیں۔ لیکن پیارے آقاؒ کا اپنے خدام گھوڑ سواروں کیلئے جذبہ Nourishment کا اندازہ لگائیں کہ آپکےؒ پیار کا یہ سمندر کسقدر تلاطم خیز تھا۔؟؟؟

۱۹۷۴ کا دردناک زمانہ آیا ہمیں مسلسل تین ماہ تک دن رات قصرِ خلافت کے احاطہ کے اندر خدمت بجالانے کی توفیق ملی۔ دن کے وقت مرکز کے حکم پر جہاں بھجوایا جاتا تعمیل کیلئے نکل کھڑے ہوتے اور رات کو حضور کے گھوڑوں کے اصطبل کے قریب سبزہ زار میں ہم ڈیوٹی دیتے۔ رات کو جب نیند آنے لگتی تو ہم خدام ایک دوسرے کو لمبی لمبی بے بنیاد کہانیاں سناتے اور جاگتے جگاتے

رہتے۔ایک رات ایک خادم نے دوسرے سے کہا کہ کوئی چائے وغیرہ مل سکتی ہے تاکہ نیند کا کچھ مداوا ہو سکے،اس نے جواب دیا رات آدھی سے ڈھل چکی ہے برتن وغیرہ بھی سنبھالے جا چکے ہیں اور ہر چیز بند پڑی ہے اب تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

بات ختم ہو گئی اور ہم سب اپنی اپنی ڈیوٹی میں مصروف ہو گئے۔ابھی بمشکل پندرہ، بیس منٹ گزرے ہونگے کہ حضورؒ کا خانساماں بڑی تھرمس میں تازہ چائے لیکر آ گیا یہ دیکھ کر ہم سب ششدر رہ گئے کہ ہم میں سے تو کسی نے بھی یہ نہیں منگوائی۔یہ کہاں سے آ گئی ؟اس پر خانساماں نے بتایا کہ حضورؒ نے مجھے ارشاد فرمایا ہے کہ اُٹھو چائے بنا کر ان خدام کو دیکر آؤ۔اس لئے میں آپکے لئے لایا ہوں۔شائد ہمارے اُس خادم کی آواز ذرا بلند تھی جس نے دوسرے خادم سے چائے بنانے کی بات کی اور وہ آواز حضورؒ اقدس نے سن لی یا پردہء غیب سے آپکےؒ دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی۔اس ساقی کا جذبہ Nourishment تو اپنا فیض جاری رکھنے کیلئے ہمیشہ ہی بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔روز اول سے ہی کالج داخل ہونے سے پہلے آپکی نظر عنائت سے لطف اندوز ہوئے پھر کالج کا سارا زمانہ اور کالج سے فارغ ہونے کے بعد بھی آپکے احسانات بدستور جاری رہے ۔پیہم دیا پیالہء مے بر ملا دیا ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا۔ سارے جہانوں کے رازق نے بھی کل کائنات میں سے آپکو چُن کر کمال محبت سے اسطرح Nourish فرمایا کہ ”میں تینوں اینا دیاں گا کہ توں رج جائیں گا،، اُس ابرِ باراں کی یہ چند بوندیں تھیں جنکا خاکسار نے نہائت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے وگرنہ آپکے قلبِ اطہر سے نکلی ہوئی اس تمنا کی گونج کیا آبادیاں اور کیا ویرانے رہتی دنیا تک سنتے رہینگے کہ ”محبت سب کیلئے نفرت کسی سے نہیں،، اللہ تعالیٰ کی آپ پر ہزاروں ہزار رحمتیں ہوں۔آمین۔

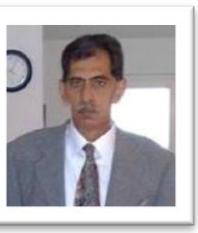

بسم اللہ الرحمان الرحیم

شریف الرحمان مرحوم کی یاد میں

تحریر: ابراہیم عثمان خان۔ فرانکفورٹ

شریف الرحمان مرحوم میرا دوست نہیں تھا۔ میرا کلاس فیلو بھی نہیں تھا۔ اور آٹھ دس سال کے عمر کے فرق کے لحاظ سے وہ میرا ہم عمر بھی نہیں تھا۔ لیکن شریف الف حمان مرحوم سے وابستہ بچپن کی ایک خوشگوار یادگار آج تک میرے ذہن پر نقش ہے اور جب سے وہ ہم سے جدا ہو کر اللہ کو پیارا ہوا ہے تب سے ماضی کی وہ خوشگوار یار گارا کثر میرے ذہن پر ابھرتی ہے اور اس کی یاد دلاتی ہے۔

شریف الرحمان نے اپنے کھیل سے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا نام روشن کیا۔ میں نے سوچا کہ کالج کے مجلہ المنار میں اسکو اپنے الفاظ میں کچھ نہ کچھ لکھ کر خراج عقیدت ضرور پیش کرنا چاہئے۔ اس لئے فن تحریر سے نابلد ہوتے ہوئے بھی قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا۔

ربوہ کی بستی میں جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے دیکھا کہ باسکٹ بال کے میدانوں میں شریف الرحمان کا طوطی بول رہا ہے اور اس نے اپنے کھیل کے سحر سے بستی والوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ لوگ جوق در جوق اس کا کھیل دیکھنے کے لئے باسکٹ بال کے میدانوں کا رخ کرتے اور اس کے کھیل سے محظوظ ہوتے۔ میں بھی اس وقت آٹھ دس سال کا ایک بچہ تھا اور بڑے شوق سے باسکٹ بال کا میچ دیکھنے جاتا تھا۔ شریف الرحمان کا دلچسپ کھیل اور لوگوں کا جوش و خروش جیسا کہ میں نے کہا ایک خوشگوار یاد کی طرح آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ شریف الرحمان باسکٹ بال کا ایک مایہ ناز کھلاڑی تھا۔ اس نے اپنے کھیل کی مہارت سے

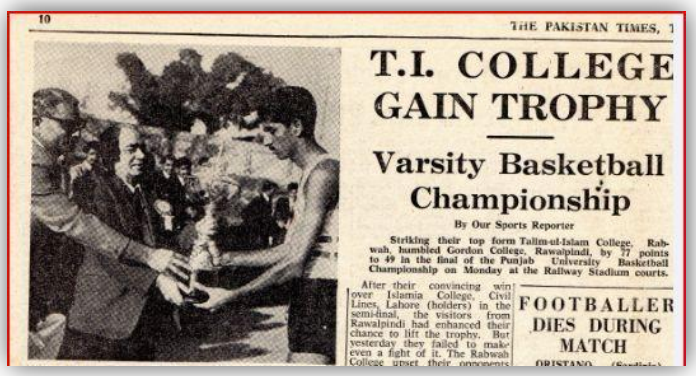

10 THE PAKISTAN TIMES, 1

T.I. COLLEGE GAIN TROPHY

Varsity Basketball Championship

By Our Sports Reporter

Striking their top form Talim-ul-Islam College, Rabwah, humbled Gordon College, Rawalpindi, by 77 points to 49 in the final of the Punjab University Basketball Championship on Monday at the Railway Stadium courts.

After their convincing win over Islamia College, Civil Lines, Lahore (holders) in the semi-final, the visitors from Rawalpindi had enhanced their chance to lift the trophy. But yesterday they failed to make even a fight of it. The Rabwah College upset their opponents

FOOTBALLER DIES DURING MATCH

ORISTANO (Sardinia)

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کو متعدد مرتبہ پنجاب یونیورسٹی چمپئن بنایااور پھر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے کھیلتے ہوئے پنجاب کو آل پاکستان یونیورسٹی چمپئن ہونے کا اعزاز دلایا۔اس نے پاکستان کی نیشنل ٹیم میں کھیلنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

ہزاروں لوگوں کے مجمع میں باسکٹ بال کھیلتا ہوا شریف الرحمان ان کا ہیرو ہوتا۔وہ جب سکوپر سکور کرتا تو ناظرین کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا۔اس کا کھیل اس قدر دلچسپ ہوتا کہ مداحوں کے دونوں ہاتھ بھی ہل جاتے یہاں تک کہ ڈی پی ای انور صاحب کو لاوڈ سپیکر پر لپک کر اعلان کرنا پڑتا کہ تالی بجانا ہمارا شعار نہیں۔ لیکن ان کا یہ اعلان ابھی مکمل نہ ہوا ہوتا کہ شریف الرحمان ایک مزید سکور کر دیتا۔اس پر شائقین کا ایک اور شور بلند ہوتا او کہ ڈی پی ای انور صاحب کا اعلان اس میں دب کر رہ جاتا۔ جونہی شور تھمتا کہ ڈی پی ای انور صاحب اپنا اعلان مکمل کرتے تو شائقین کی شرمندگی پر مبنی مسکراہٹ اپنی بے بسی کا اظہار کر رہی ہوتی۔شریف الرحمان دراز قد تھا اور اس کے مطابق ہی اس کے پاوں کا سائز بھی بڑا تھا۔غریب درویشوں کی بستی میں اس وقت بوٹوں کی صرف ایک دکان تھی رشید بوٹ ہاوس جس میں شریف الرحمان کے پاوں کے سائز کا فلیٹ بوٹ ناپید تھا۔اس لئے وہ مجبوا ننگے پاوں ہی کھیلتا تھا۔لیکن وہ ان ننگے پاوں کے ساتھ بھی مد مقابل ٹیم کے پاوں تلے سے زمین نکال دیتا۔ جب وہ اپنے دراز قد کے ساتھ ہاتھ میں بال لے کر سکور کرنے کے لئے فضاء میں بلند ہوتا تو مخالف ٹیم کے کھلاڑی اس کی بلندی کو چھو بھی نہیں سکتے تھے اور ان کی چھلانگ تو بس ہوائی چھلانگ ہی ثابت ہوتی۔

شریف الرحمان جس بستی کا رہنے والا تھا وہ اس بستی کی معاشرتی اور سماجی زندگی کا پروفیسر تھا۔بستی کے اونچے چوباروں سے لے کر جھونپڑیوں میں رہنے والے گداگروں کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا اس نے اس قدر گہرائی سے مطالعہ کر رکھا تھا کہ وہ جب بھی دوستوں کی مجلس میں اپنے معاشرہ کے بعض کرداروں کو بیان کرتا تو سننے والوں کے ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ جاتے اور ہنسی رکنے کا نام نہ لیتی۔ایسی ہی ایک مجلس میں جب اپنی بستی کے ایک گداگر جوڑے کے بارے میں بیان کر رہا تھا کہ دن گھر بھیک مانگنے کے بعد شام کو جب دن بھر کی کمائی کا حساب کر رہے تھے اور اپنے اپنے حصے پر ان میں ان بن ہو گئی تو وہ ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے تھے، جہاں میں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا وہاں میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ دراز قد نوجوان تو رستہ چلتے اپنے سر کو

جھکائے ہمیشہ نظریں زمین پر رکھتا ہے وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے رویوں کو کس قدر باریک بینی سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ اسی لئے میں اس کو معاشرتی رویوں کا پروفیسر کہا کرتا تھا۔

شریف الرحمان اپنی بستی ربوہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ بستی جس نے اسے علم کی دولت سے سرفراز کیا۔ اسے شعور عطا کیا اور اسلام کی عظیم الشان روحانی تعلیمات سے روشناس کرایا، اس کے لئے وہ اپنے دل میں تشکر کے جذبات رکھتا تھا۔ وہ اس جذبہ کو زندگی بھر ساتھ لے کر چلتا رہا۔ وہ جب جرمنی میں اس دنیا سے رخصت ہوا اس وقت بھی وہ اپنے حلقہ کا صدر جماعت تھا۔ وہ ان لوگوں کر رد کرتا تھا جنہوں نے اس بستی سے سب کچھ حاصل کیا اور پھر نہ صرف اس کو بھلا دیا بلکہ فری تھنکر بن کر جن خیالات کا وہ اظہار کرتے ہیں اس سے ناشکری کی بو آتی ہے۔

شریف الرحمان سے ایک یاد اور بھی وابستہ ہے اور وہ یاد اس کے کھیل سے زیادہ میرے جسم اور میری روح کو گرماتی ہے۔ یہ تحریر نامکمل رہ جائے گی اگر اس کا ذکر نہ کیا جائے۔

شریف الرحمان کے جلیل القدر والد محترم اور ہمارے انتہائی قابل صد احترام استاد حضرت چوہدری عبدالرحمان صاحب اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ

خدا کے ایک بہت ہی پیارے عباد الرحمان میں سے تھے جن کی تمام عمر حقوق العباد کے لئے وقف تھی۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا کہ وہ اللہ کے بندوں کے دکھوں اور تکالیف میں ان کے کام آئیں۔ شعبہ تعلیم سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کا واسطہ بہت سے ایسے طلباء سے ہوتا تھا جن کو فیس ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہ ہوتے تھے کہ وہ نصاب کی کتب خرید سکیں۔ آپ ہمیشہ اس جستجو میں لگے رہتے کہ کسی طرح ان کی فیس معاف ہو جائے۔ جو آدھی دے سکتا ہے اس کی آدھی معاف ہو جائے۔ سال بھر ان کے لئے کتابیں اور کاپیاں اکٹھے کرتے رہتے اور جونہی کوئی ضرورتمند طالب علم آتا، آپ اس کو پیش کر دیتے۔ آپ کی بے مثال تصنیف مدینہ ریاضی بھی اس میں شامل تھی۔ میرے والد محترم مسعود احمد دہلوی مرحوم و مغفور جب بھی آپ کا ذکر کرتے ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ آپ نے بارہا ذکر کیا کہ میں جب بھی کسی غریب طالب علم کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کبھی ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے اس کی مدد نہ کی ہو۔ اس قسم کی نیکیوں کی توفیق صرف انہی کو ملتی ہے جن کو خدا کی طرف سے یہ عطا کی گئی ہو۔ وما یلقھا الا الذین برو وما یلقھا الا ذو حظ عظیم

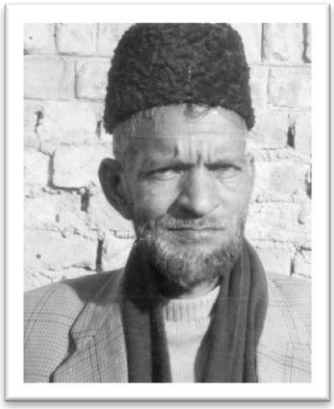

کمزور طالب علموں پر خصوصی توجہ دیتے،ان کو بلا معاوضہ اضافی وقت دیتے،اور پھر رو رو کر خدا کے حضور ان کے لئے دعائیں کر تے۔دعاوں کے طفیل خدا تعالیٰ آپ کی ایسی رہنمائی فرماتا کہ آپ ان بچوں کو ان کے مطابق امتحان کی تیاری کرواتے اور وہ کمزور طلباء بھی امتحان میں کامیاب ہو جاتے۔مکرم بشیر احمد خان رفیق ،سابق امام لندن، نے اپنی کتاب خوشگوار یادیں میں آپ کی اس صفت کا بہت ایمان افروز رنگ میں ذکر کیا ہے۔آپ جب اس جہان سے رخصت ہوئے تو آپ کے بچے ابھی چھوٹے ہی تھے۔ شریف الرحمان اور ان کے بھائی ابھی سکول یا کالج میں بمشکل انتدائی کلاسوں میں تھے لیکن ہم جو ربوہ کے رہنے والے ہیں اس بات کے شاہد ہیں کہ اس بزرگ کی اولاد پر خدائے رحمان کا سایہ تھا۔میں نے ان بھائیوں کو زندگی کی تمام تر راہوں میں ہمیشہ ہمستے مسکراتے دیکھا۔دوستوں میں ہوں یا سکول کالج آجارہے ہوں یا کھیل کے میدان میں ہوں،ان کو دیکھ کر کبھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ایک شفیق باپ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ چکا ہے۔کھیل کے میدان میں شریف الرحمان سب لوگوں کا ہیرو ہوتا تھا۔میچ ختم ہو گیا۔سب لوگ ٹولیوں کی صورت میں گھر کی طرف رواں ہیں۔ہر ٹولی میں شریف الرحمان کے کھیل کی تعریف ہو رہی ہے۔ مسیح پاک کے غلاموں کی اس بستی میں ہزاروں بزرگ ہیں جو ہر وقت ایسے بچوں کا حال احوال پوچھ رہے ہیں اور دعائیں دے رہے ہیں۔اساتذہ ہیں جو ان سے بے حد شفقت کر رہے ہیں۔

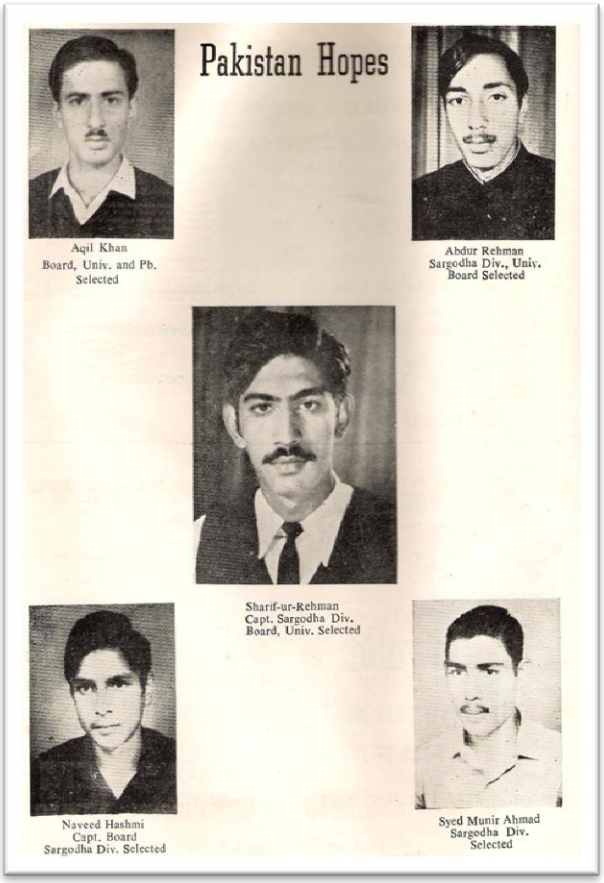

محترم پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب نے تو شریف الرحمان کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔وہ اسے بڑے مان سے بلاتے تھے۔ شریف الرحمان آپ کے ہزاروں شاگردوں میں واحد شاگرد تھا جو آپ سے ناراض بھی ہو جاتا تو اسے بڑے پیار سے مناتے اور اس کے ناز نخرے اٹھاتے۔میں نے خود دیکھا کہ کھیل کے دوران جب شریف الرحمان غصے میں ہوتا تو چوہدری صاحب اس کے کان میں خرگوشی کرتے تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی۔میں یہ ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ ہم نے دیکھا کہ خدا کے اے ک بندے کی اولاد پر کس قدر خدائے رحمان کا سایہ تھا۔آج شریف الرحمان کے بچوں پر بھی بظاہر ایسا ہی وقت ہے کہ ان کے سر سے ایک شفیق باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔لیکن خدائے رحمان کا سایہ نہیں اٹھا۔وہ ہمیشہ سے اس گھر پر ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ رہے گا۔اللہ تعالیٰ شریف الرحمان کو اپنی جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور اس کے بچوں پر اسکی رحمت کی بارش برستی رہے۔اور وہ دین و دنیا میں کامیاب وکامران ہوں۔آمین۔ثم آمین۔

اے شقی القلب

راجہ محمد یوسف خان

جُبّہ و دستار ہیں پر کام انسانی نہیں
کون سا فتنہ ہے جس کا آج تُو بانی نہیں

قتلِ ناحق پر تجھے کوئی پشیمانی نہیں
اے شقی القلب ! تجھ کو موت کیا آنی نہیں

ہے کوئی ایسا عمل تیرا جو شیطانی نہیں
کذب و استکبار میں کوئی ترا ثانی نہیں

بد قماش و جعلساز و خو گرِ مکر و فریب
کوئی بھی صورت تری دنیا میں انجانی نہیں

دشمنِ حق خندہ زن ہے تیری اِن حرکات پر
تجھ کو اے جاہل مگر کوئی پریشانی نہیں

کونسا انداز تیرا ہے لطیف و دلنشیں
کونسی تقریر تیری بادِ طوفانی نہیں

جِس سے تُو منسوب ہے اُس قریۂ صد رنگ کو
اپنے ہاتھوں سے جلا دینا نگہبانی نہیں

ڈھونڈنے نکلے ہیں گھر سے منزلیں جو نوجواں
تجھ سے بڑھ کر کوئی اُن کا دشمنِ جانی نہیں

ہے کوئی اخبار جس پر خون کے دَھبّے نہ ہوں
کونسی ایسی خبر ہے جو کہ ہیجانی نہیں

فتویٔ اہلِ حرم بھی، شُکر ہے، جاری ہوا
خودکشی یہ، راہِ حق میں کوئی قربانی نہیں

ا

سُوءِ ختم الرّسل ہے رحمتِ ہر دو جہاں
قتلِ معصوموں کو کرنا حکمِ ربّانی نہیں

وادیٔ تاریک ہی تیرا مقدّر ہو گئی
تُو نے اہلِ معرفت کی قدر پہچانی نہیں

ہوئی ہے تیغِ مکافاتِ عمل پھر بے نیام
دل گرفتہ تو ہوں لیکن کوئی حیرانی نہیں

آئینہ ہم نے دکھایا ہے کُھلے الفاظ میں
کیا کریں اب اور، تجھ کو شرم تو آنی نہیں

سچ فقط لکھتے ہیں یوسفؔ، اور اُن کے ہاتھ میں
ایک سادہ سا قلم ہے، خامۂ مانی نہیں

۔۔۔بہار ضرور اُترے گی

ڈاکٹر عمران احمد خان۔ ربوہ

میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو بھاگ کر کواڑ کی اوٹ لے لی۔ دانتوں میں انگلی دبائے، بغیر پلکیں جھپکائے اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا تب جوتی کا وہ پیر جو گھبراہٹ میں پیچھے رہ گیا تھا واپس پہنا اور دُھول سے اٹی کھیل کود میں پھر سے مصروف ہو گیا۔ نہ جانے ناٹے قد کا وہ باریش پٹھان اب بھی جیتا ہے یا نہیں جو صبح کے سکوت میں ''بالن بالن'' کی آواز لگاتا ہوا نمودار ہوتا اور اس کے اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی مدھر آواز خنک ہواؤں سے ہم آہنگ ہو کر ہمارے خوابیدہ ذہنوں پر دستک دیتی۔ اور پھر پرالی سے لدے اونٹوں کے قافلے بھی تو اسی چاہت کے موسم کا سندیسہ لئے ہوئے ماحول میں در آتے۔ یقین کی پہلی منزل طے ہوتی اور الٹی گنتی شروع ہو جاتی کہ روحانی بہار کے وہ ایام جن کی بنیاد خالصتاً دینی اور روحانی مقاصد کے تحت رکھی گئی سر پر آن پہنچے۔

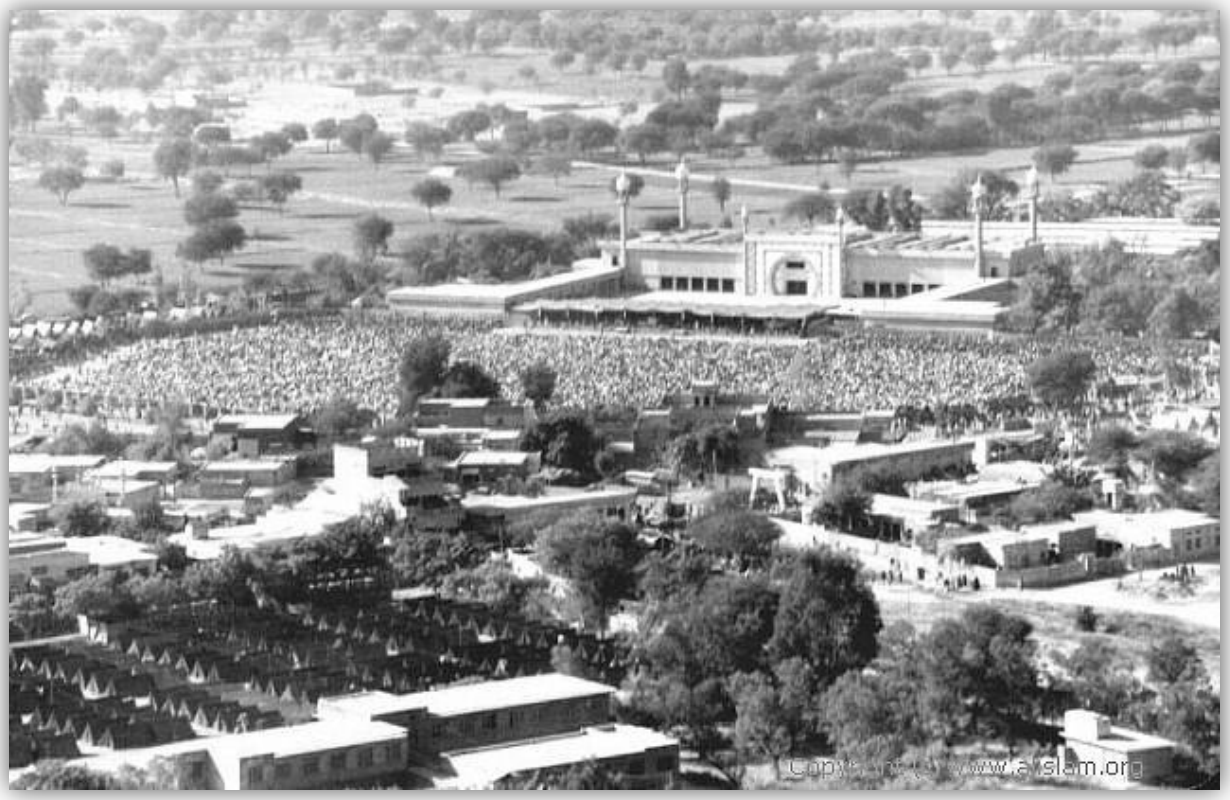

جلسہ سالانہ ربوہ کا ایک منظر

ویسے تو ایک جلسہ سالانہ گزرنے کے ساتھ ہی اگلے جلسہ کی تیاری کسی نہ کسی رنگ میں شروع ہو جاتی جیسا کہ ہماری والدہ ہر ماہ اس نیت سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا شروع کر دیتیں کہ ایک ماہ کا بجٹ جلسہ کی مہمانداری کا متحمل نہ ہو سکتا تھا خاص طور پر چینی کا

اسٹور کرنا جو اس زمانے میں بہت ناپید ہوتی تھی مجھے خوب یاد ہے۔ جوں جوں یہ دن قریب آتے اہلیان ربوہ کی تیاریوں میں تیزی آجاتی اور روز کوئی نہ کوئی سرگرمی دیکھنے کو ملتی۔ لوگ اپنی اپنی توفیق اور ضرورت کے مطابق گھروں کی مرمت اور رنگ سفیدی وغیرہ کرواتے، محلہ کی انتظامیہ کا گھر گھر سروے کرنا کہ آپ کتنی جگہ جماعتی انتظام کے تحت مہمانوں کو ٹھہرانے کے لئے دے سکتے ہیں۔ ڈیوٹیوں کے لئے ذیلی تنظیموں کی طرف سے فرداً فرداً رابطہ کہ گزشتہ سال آپ نے کہاں ڈیوٹی دی تھی اور اس سال کہاں ڈیوٹی دینا چاہیں گے۔ لنگر خانوں کی مرمت تندوروں کی تنصیب اور بعدہ مشینوں کی صفائی اور سروس۔ پرائیوٹ قیام گاہوں میں طہارت خانوں کی تعمیر۔ عزیز رشتہ داروں کی طرف سے خطوط کا آنا۔ اکثر ان کی طرف سے آنے کی خوشخبری اور کبھی اس بات کا ملال کہ اس بار چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے وہ شاید نہ آسکیں۔ میری ہم عمر پھوپی زاد بہنوں کی طرف سے یہ پیغام بھی آتا کہ پرالی (جسے ہم اردو میں کسیر کہتے تھے) ہمارے آنے سے پہلے نہیں بچھانا ہم نے اس پر اچھل کود کرنی ہے۔ آج وہ اس بات کی گواہی دیں گی جاہے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ہی دیں۔ محلے کی بیوت میں ڈیوٹی چارٹ آویزاں ہوتے اور اس میں اپنا نام پا کر اپنی اہمیت کا احساس اور خود اعتمادی پیدا ہوتی۔ ہر جمعہ کو علی الصبح وقار عمل کے ذریعے جھاڑ جھنکاڑ اور راستوں کی صفائی وغیرہ سے شہر کو غریب دلہن کی طرح سجایا جاتا۔

۲۲ دسمبر کی شام تین بجے دفتر جلسہ سالانہ میں حضرت خلیفۃ المسیح خطاب فرماتے اور کارکنان باقاعدہ طور پر اپنے اپنے شعبہ میں ڈیوٹیوں پر رپورٹ کرتے۔ ۲۵ دسمبر کو شہر کی رونق بام عروج پر ہوتی۔ اسی فیصد مہمانوں کی آمد اسی دن ہوتی۔ قافلہ ہائے شوق اڈے چلے آتے۔ اڈے پر بسوں کا تانتا بندھا ہوتا۔ چھتوں پر بندھے بستر بند ان کے اسپیشل ہونے کا پتہ دور سے دیتے۔ تانگوں پر بیٹھ کر یہ اپنی اپنی منزل کی راہ لیتے اور الفت و یگانگت کی بھیڑ میں گم ہو جاتے۔ نارووال سے آنے والی سپیشل ٹرین ہر اسٹیشن پر ٹھہر کر بھول جاتی اور پانچ گھنٹے کا سفر دس گھنٹے میں طے کر کے جب دریا پر پہنچتی اور پلوں کی گونج میں نعرہ ہائے تکبیر کی صدا بلند ہوتی تو ساری تھکان چناب کے پانیوں میں بہہ کر کہیں دور کی راہ لیتی اور راہِ وفا کے یہ مسافر (شاید زیر آب ٹرین سے پیرس پہنچنے والوں سے بھی زیادہ تازہ دم) شہر میں خیمہ زن قوس وقزح میں تحلیل ہو جاتے۔ اس روح پرور منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے انہیں لینے آنے والے بعض نوجوان چنیوٹ تک چلے جاتے۔ باہمی اخوت کا یہ عالم ہوتا کہ جس کے گھر جتنے زیادہ مہمان ہوتے وہ اتنا ہی پھولا نہ سماتا اور ایسے خوش ہوتا جیسے بونڈ کی قراندازی میں پہلا انعام نکل آیا ہو۔ اسی طرح اگر کسی وجہ سے کسی گھر میں مہمان کم ہوتے تو کم مائیگی کا احساس اس کے چہرے سے عیاں ہوتا۔

مرزا امیر صاحب ابن مکرم سلطان احمد پیر کوٹی صاحب (مرحوم) جو مجھ سے تین گھر آگے رہتے ہیں بتاتے ہیں ایک بار ہمارے ہاں ۸۰ مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ پرچی تصدیق والے اس خیال سے کھانا ضائع نہ ہو پڑتال کرنے گھر آئے کہ تین کمروں کا گھر اور اسی مہمان۔ کمروں کے باہر جوتیوں پر دور سے نظر پڑی تو وہیں سے الٹے پاؤں لوٹ گئے۔ صحن میں لگے خیمے شاید ابھی انہوں نے نہیں دیکھے تھے۔ ہم آج بھی اس فاتحانہ لمحے کو یاد کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ ٹورنٹو، ہمبرگ اور سڈنی میں آنکھ کھولنے والے بچے اگر یہ سب کچھ دیکھیں تو انہیں میسر سہولتیں کچھ دیر کے لئے اپنی اہمیت کھو بیٹھیں۔ جلسہ کے پروگرام کے آغاز سے قبل تمام

مرد وزن سڑک کے دونوں اطراف اپنی معین کردہ راہوں پر مرکزی مقام کی طرف رواں دواں ہوتے اپنے امام کے ارشادات سے مستفیذ ہوتے پر جوش نعروں سے ان سے اظہار یکجہتی کر کے تجدید عہد کرتے۔ علمائے سلسلہ کی تقاریر سنتے۔ مکرم شبیر صاحب اور ثاقب زیروی صاحب کے ترنم سے لطف اندوز ہوتے۔ کنواور مونگ پھلی بھی ساتھ ساتھ ہوتے۔ علی الصبح ۴ بجے بیوت الذکر خصوصاً مرکزی بیت المبارک میں نماز تہجد فجر، عزیزوں بزرگوں کی قبروں پر دعا سے لیکر شبینہ اجلاس اور حضرت خلیفۃ المسیح سے اجتماعی ملاقاتوں تک روحانی برکات سمیٹنے کا عمل جاری رہتا اور پلٹ کر جھپٹنے والا یہ سلسلہ سرد موسم میں لہو کو گرمائے رکھتا۔ رات کو گولبازار میں خصوصاً نوجوانوں کا خریداری اور کھانے پینے کا رش بھی قابل دید ہوتا۔

گرم چائے اور قہوے کے دور کے ساتھ رات گئے تک خاندانی گپ شپ کی مجلسیں بھی لگتیں انہی اوقات کار اور جگہ کی حالت زار میں گھر کے بزرگ مستقبل کے کچھ سنجیدہ فیصلوں کے لئے کسی کونے میں سر جوڑ کر بیٹھتے۔ دھیرے دھیرے مچلنے والے بیقرار دل بھی کہیں آس پاس ہی دھڑک رہے ہوتے۔ حتمی شکل اختیار کرنے والے عشاء کے بعد بیت المبارک میں اجتماعی ایجاب و قبول کیلئے موجود ہوتے۔

لنگر خانوں کے ماحول میں ہاتھ میں کپڑا اور بالٹی اٹھائے، بل کھاتی خوش باش چہروں کی دوہری تہری لائنیں، روٹی پھیلانے کی تھپک، لگانے کی دھمک اور سلاخوں کی کھنک، نانبائیوں کا شور آلو گوشت کا شوربہ اور درویشوں کے نان جب خوشبو دیتے تو وہ سماں بنتا کہ آج کے چائنیز اور KFC چوکڑی بھول جائیں۔ شہر کی آبادی یکدم چھ، سات گنا بڑھ جانے سے صفائی کا نظام بھی بہت دباؤ میں ہوتا اسے کرنٹ بنیادوں پر چلانے والے بڑی مستعدی سے یہ ڈیوٹی دیتے۔ فکسڈ نظام آنے سے سر پر فلک ہاتھ میں دمدار ستارے والے وہ اسم با مسمیٰ حلال خور معدوم ہوگئے جو انتہائی کم مشاہرے پر اوور ٹائم بھی لگاتے۔ ہمارا یہ جلسہ سماجی معاشرتی دینی و روحانی حسن و رعنائی کا مرقع ہوتا اور ہر کوئی اپنی عمر اور ظرف کے لحاظ سے اس کی برکات و فیوض سے مستفید ہوتا۔ بچوں کو کھانے پینے کے اسٹال، سلائیڈوں والی دوربین وغیرہ، جلسہ گاہ کی پارکنگ میں کھڑی ڈڈو کاروں اور الکیمسٹس کے ساتھ خالی جگہ پر قائم دفتر معلومات سے گمشدگی و برآمدگی کے اعلانات میں بھی دلچسپی ہوتی، لیکن وہ بڑوں کو دیکھ کر سیکھنے کے عمل سے بھی گزر رہے ہوتے۔ ڈیوٹیوں پر موجود مرد وزن بیچ میں ٹائم نکال کر مختلف پروگراموں میں شامل ہوتے اور جن کو توفیق ملتی نیکی کے ان لمحات کو نیبو کی طرح نچوڑتے۔ ان نوجوانوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو سردی کی یخ بستہ راتوں میں چہرے پر مفلر لپیٹے اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گھاس پھونس اور لکڑیوں سے آگ جلا کر راستوں پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی دیتے۔ خطرے کی نوعیت اتنی نہ تھی کہ یہ سو روپے کی گھڑی چرانے والے ڈاکوؤں کا بچیوں کی بانہوں میں پکڑے جانے کا دور تھا۔ اور پھر چک منگلا سے آنے والے دیہاتی بزرگ جو سڑک کے کنارے اپنے مخصوص لہجے میں پنجابی نظمیں سنا رہے ہوتے جیسا کہ ''قادیاں دے وچ ہو یا مہدی دا ظہور اے'' ہر راہ گیر کو رکنے پر مجبور کر دیتے۔

اور اب کچھ ذکر اختتامی لمحات کا۔ جن میزبانوں نے ان ساعتوں کو لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتے دیکھا ان کا سمٹنا بھی تو انہوں نے ہی دیکھنا ہوتا۔ ۲۹ دسمبر کو ۸۰ فیصد مہمان لوٹ جاتے۔ جانے والوں کو ہم ایسی بے بسی سے دیکھتے جیسے بچہ ہاتھ سے چھوٹ جانے

والے گیسی غبارے کو اور شہر کو ایسے جیسے کوئی مالدار اپنی کٹی ہوئی جیب کو دیکھتا ہے۔ بازاروں میں دکانداریوں محسوس ہوتے جیسے گرمیوں میں ہیٹر بیچنے والے یا پھر ربوہ میں RAIN کوٹ بیچنے آئے ہوں۔ مہمانوں میں سے صرف ڈیرہ غازی خان کا ''بخشی'' رہ جاتا جو قافیہ پر قافیہ ملانے اور بے تکان بولتے چلے جانے کی مہارت کی وجہ سے یہاں اور وہاں بچوں کی ٹولیوں کے ساتھ محفل لگائے کھڑا نظر آجاتا اور پھر مارچ میں ''مشاورت'' کے بعد وہ بھی واپس اپنے دیس چلا جاتا۔

میں نے تو بطور میزبان اپنے جذبات کی ایک جھلک دکھائی ہے آنے والے تیاری کے کن پر مسرت لمحات اور دفتر جلسہ سالانہ اسے موجودہ شکل دینے کے لئے کن مراحل سے گزرتے اس کا احاطہ کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔

برسوں کے ساتھ سمٹ سمٹ رہے ہیں۔ میں آج بھی اس بستی میں ان کے ہمراہ جو صرف اسی جگہ ان لوگوں کے انتظار میں جو دنیا میں کسی بھی جگہ ان میں شمولیت کی توفیق رکھتے ہیں چاہت کے ان دنوں کی راہ تک رہا ہوں جب تھکن آرام جاں اور رتجگے تسکین جاں کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ دن آتے ہیں جب ظلم کی برچھی ٹوٹ کر گرے گی۔ نفرتوں کے الاؤ پر محبتوں کی پھوار غالب آئے گی ۔ مصائب کے ہمالہ سے آشتی کی سحر پھوٹے گی۔ بچھڑے پھر ملیں گے ۔ اہل وفا کی قربانیوں کی جوئے خوں اسے سینچ رہی ہے

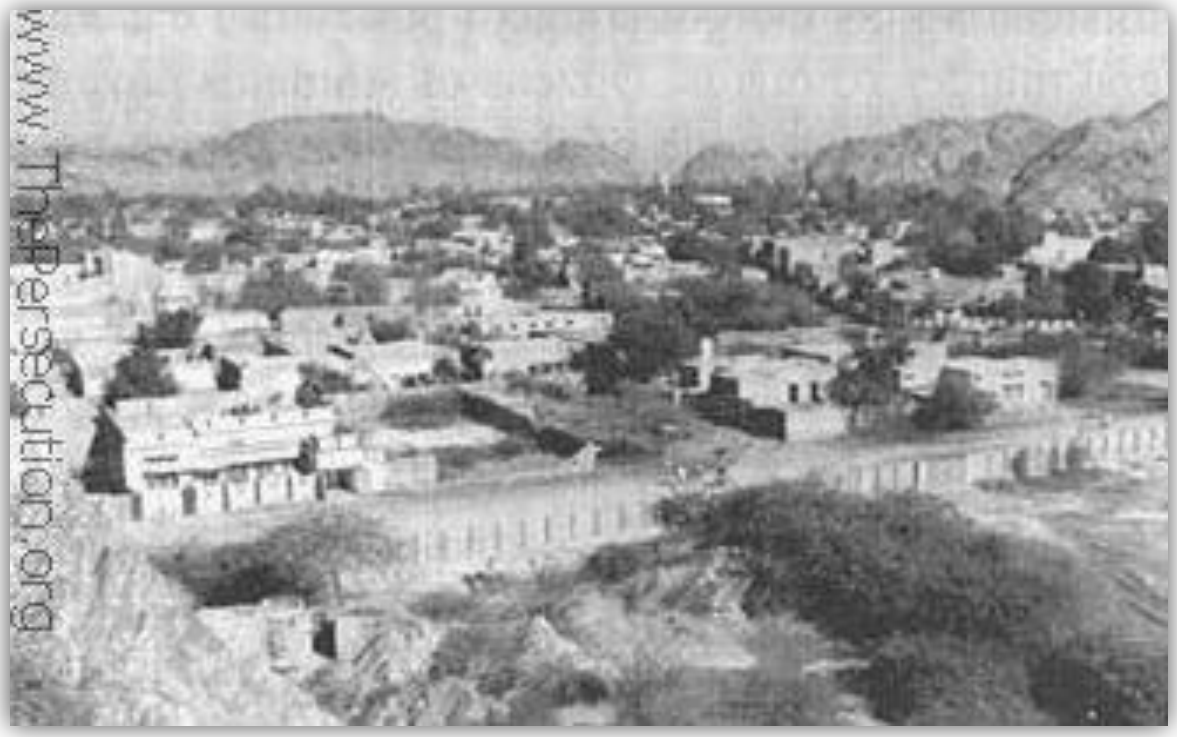

ہمارے بچوں کے جذبات کی خزاں رنگ کونپلوں پر بہار ضرور اترے گی۔

آنے والا دور نہ کل سا ہوگا　　کیا کوئی شک ہے کہ جلسہ ہوگا
پھر وہی رنگ جمیں گے ہر سو　　ہم نہ ہوں گے تو کوئی ہم سا ہوگا

حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کا امریکہ میں ورود اور قیام
مجلس طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ

مکرم پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خان صاحب

ایک عرصہ سے کنیڈا اور امریکہ کے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے تعلیم الاسلام کالج کے طلباء جب کبھی جلسوں، اجتماعات پر ملتے تو اپنی مادرِ علمی سے متعلق اپنی یادوں کو تازہ کرتے، اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے، اپنے ہم مکتبوں کی خیر و عافیت معلوم کرتے، غرضیکہ تعلیم الاسلام کالج ایک گھر تھا اور ہم سب ایک خاندان کے افراد۔ جس میں ہر سال اضافہ ہوتا، اور فارغ التحصیل زندگی کی جدوجُہد میں شامل ہونے کے لیئے حسین یادوں کو سینے سے لگائے رخصت ہوتے، اور میدانِ عمل میں اپنی محنت اور لگن سے داد وصول کرتے۔ تعلیم الاسلام کالج نے نوجوانوں کا ایک منفرد معاشرہ قائم کیا، جو اتنے سال گزرنے کے باوجود پیار، محبت اور خلوص کی مضبوط اور گہری بنیادوں پر قائم و دائم ہے۔ 1944-45 کے قدیم طلباء سے ذکر کیجیئے، وہ اپنے وقت کے اساتذہ اور کلاس فیلوز کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کریں گے۔ ان طلباء کی ہمیشہ سے خواہش رہی، کہ انہیں کوئی فورم مہیا ہو جہاں وہ وقتاً فوقتاً اکٹھے ہو کر اپنی مادرِ علمی کو یاد کر لیا کریں، اور جو اسکی کھوکھ سے تربیت حاصل کی ہے شیئر کر سکیں۔ کنیڈا اور امریکہ میں مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج قائم کرنے کے خیال کا سہرا مکرم ڈاکٹر ناصر احمد صاحب پرویز پروازی کینیڈا اور ان کے امریکن ہم خیالوں کے سر ہے۔ یہ پہلی کوشش 2003 میں ہوئی، مگر بدقسمتی سے ہم خیالوں کے درمیان سطحی قسم کے اختلافات کی وجہ سے یہ مجلس معرضِ وجود میں نہ آسکی۔

اس دوران 2005 میں جرمنی میں طلباء قدیم مکرم پروفیسر حمید احمد صاحب کی صدارت میں مجلس قائم ہے اور اپنی کاروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ اور اسے خلیفہ وقت کی دو بار مہمانداری کا منفرد اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔ امریکہ میں مجلس قائم کرنے کی دوسری کوشش 2006 میں ہوئی، اُس سال جلسہ سالانہ کے دوران انتخاب ہوا۔ انتخاب منظور ہوا۔ ایک دو اجلاس منعقد ہوئے، مگر عہدے داران کے باہمی اختلافات پاؤں کی زنجیر ثابت ہوئے۔ تعلیم اسلام کالج الومنائی امریکہ ((TICAUSA کو حدود میں قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اور مجلس کو جلد ہی خیر باد کہہ دیا گیا۔

گزشتہ سال حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ نے الومنائی کے کچھ ممبرز کی درخواست پر ازراہِ کرم محترم مکرم امیر صاحب امریکہ کی معرفت انجمن طلباء قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کے قیام کی منظوری عطا فرمائی، الحمدُللہ۔ چنانچہ امسال جلسہ سالانہ امریکہ کے دوران 30 جون 2012 بروز ہفتہ الومنائی یو ایس اے کے عہدے داران کا الیکشن محترم مسعود ملک صاحب جنرل سکریٹری

جماعت امریکہ کی زیرِ نگرانی اور مکرم عطاالمجید راشد صاحب صدر مجلس برطانیہ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ حضور نے ازراہِ شفقت درجِ ذیل نتائج کی منظوری عطا فرمائی :

صدر: پروفیسر محمد شریف خان　　سیکریٹری: راجہ ناصر احمد　　فنانس سیکریٹری: پرویز اسلم چوہدری

اگزیکٹو ممبر 1: ناصر جمیل　　اگزیکٹو ممبر 2: ڈاکٹر صفی اللہ ورائچ

2010 سے برطانیہ میں مجلس کا اجراء زیرِ صدارت مکرم عطاء المجیب راشد صاحب ہو چکا ہے۔ جبکہ کینیڈا میں اس سال مجلس کے اجراء کی اطلاعات ہیں۔ جرمنی اور کینیڈا میں یہ آسانی ہے کہ تعلیم الاسلام کالج کے اکثر طلباء ایک ہی شہر یا قریب کے شہروں میں رہتے ہیں، ان سے ذاتی رابطے اور میل ملاپ کے لیئے وہ مسائل نہیں جو امریکہ میں ہیں، یہاں طلباء ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہونے اور کاروبار کی مصروفیات کے باعث ان سے رابطہ ای۔ میلوں، فونز، اور خط و کتابت سے ممکن تو ہے مگر جو بات ذاتی میل ملاپ کے ذریعے رابطہ کرنے میں ہے وہ ان کمزور ذرائع سے ممکن نہیں، اکثر لوگ ہفتہ پندرہ دن بعد ای۔ میل چیک کرتے ہیں، کئی لوگ مصروفیات اور دوسری وجوہ کے باعث فون پر دستیاب نہیں ہوتے۔ اس لیئے یہاں سیکریٹری کا کام مشکل اور مصروفیت رابطوں میں نسبتاً گئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

حضور ایدہ اللہ کی ہدایت اور خواہش کے مطابق پاکستان میں احمدی طلباء کی امداد کے سلسلے میں لبیک کہتے ہوئے مجلس جرمنی ایک عرصے سے امدادی رقوم حضور ایدہ اللہ کی خدمت میں پیش کرتی رہی ہے۔ یو ایس اے مجلس نے اس مد میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے لبیک کہتے ہوئے امسال 13000 ڈالر کی رقم جمع کر کے حضور کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی، جبکہ اطلاعات ہیں کہ مجلس کینیڈا نے اس مد میں 16000 کینیڈین ڈالر کا عطیہ جمع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام معطیان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ الحمدُللہ

امریکہ اور جرمنی کی مجالس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج کی سرگرمیاں اراکین مجلس اور عام احباب کی اطلاع کے لیئے internet پر درجِ ذیل سائیٹ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ ان سائیٹس پر ان مجالس کی کارکردگی سے متعلق مواد باقاعدگی سے

upload ہوتا رہتا ہے۔احباب سے درخواست ہے گاہِ گاہِ ان sites کو visit کر کے اپنی رائے سے ان مجالس کے سیکریٹریان کو مطلع کرتے رہا کریں:۔

Germany : http://ticollegerabwah.com

USA: http://ticalumniusa.org/

برطانیہ اور کنیڈا کی مجالس کی internet cite قائم کرنے کے لیئے کوششیں جاری ہیں۔ الحمدُللہ مجلس برطانیہ "المنار" کا ماہوار Internet edition باقائدہ شائع کر رہی ہے جس کے شمارے Al-Islam.org کی سائیٹ پر دیکھے جا سکتے ہیں:

http://www.alislam.org/r.php?q=almanar

اسی طرح مجلس جرمنی کا "المنار http://ticollegerabwah.com "پر پڑھا جا سکتا ہے۔

امریکہ میں حضور خلیفتہ المسیح الخامس ایدہ تعالیٰ کا امسال جلسہ سالانہ کے دوران اور بعد پروگرام اتنا tight رہا کہ حضور سے ملاقات سے مجلس کے ارکان مشرف تو نہ ہو سکے۔ البتہ حضور ایداللہ نے ازراہِ شفقت ممبران کے ساتھ تصویر کھنچوانے کا اعزاز بخشا۔ الحمدُللہ تعالیٰ۔

مجلس امریکہ کے عہدیداران اور جملہ اراکین محترم مکرم چوہدری ظہیر احمد صاحب باجوہ، نائب صدر جماعت امریکہ کے تہ دل سے سپاس گزار ہیں کہ آپ نے مجلس کے قیام اور دوسرے مسائل حل کرنے میں ہر قدم پر ہماری مدد کی۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیرا۔

احبابِ جماعت سے مجلس کے ممبران کے لیئے دعا کی درخواست ہے کہ ہمیں اپنے فرائض سے بااحسن وخوبی عہدہ براء ہونے کی توفیق ملے۔ آمین

خاکسار محمد شریف خان

صدر مجلس، الومنائی تعلیم الاسلام کالج، امریکہ

یادرفتگاں

پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان مرحوم

غزل

یہ موج بے خودی نجانے چڑھ کے کب اتر گئی
لو بے پتہ سی بے مزہ سی زندگی گزر گئی

خرام ناز بادہے کہ صرصر فنا کی رو
چمن میں یوں گلاب کی جو پنکھڑی بکھر گئی

شعاع نور یک بیک فضا کو جیسے چیر جائے
دل و نظر میں اس طرح نگاہ یار اتر گئی

تو لیلیٰ حیات ہے غبار کارواں ہیں ہم
ادھر اٹھی یہ خاک دل جدھر تری نظر گئی

رہین لطف یار ہے سیاہیٔ غبار دل
یہ زلف عنبریں کبھی بگڑ کبھی سنور گئی

نصیر دھوپ چھاؤں میں بھی راہ پر نہ آ سکے
کہ جاں کے ساتھ جائے گی یہ کجروی اگر گئی

ماخوذ از المنار جنوری تا مارچ ۱۹۶۶

بسم الله الرحمن الرحيم

In the name of Allah, the Gracious, the Merciful
Im Namen Allahs, des Gnädigen, des Barmherzigen.

Quarterly Magazine of

T.I. College Old Students Association Germany

English and German Section

ALMANAR

December 2012

Director: Prof. Hamid Ahmad Chaudhry
Editors: Frau Munnazza Aqil Khan
Frau Areeba Dogar
Design: Muhammad Zaheer Ahmad (Software Engineer)

We wish our readers a

HAPPY NEW YEAR

May Allah bless you and your loved ones with a long, life of peace, prosperity and good health. Amen

****

Wir wünschen unseren Lesern

EIN FROHES NEUES JAHR

Möge Allah Euch und Eure Liebsten durch ein glückliches, friedliches und gesunds Leben segnen.

Contents

Inhalt

Nr.	Artikle	Page
1	Editorial – Prof. Hamid Ahmad Chaudhry	1
2	Poem “Urdu” Mubasher Ahmad Solangi	4
3	Reaktionen von Muslimen auf blasphemische Taten Frau Arreba Dogar	5
4	Existiert Gott? Munazza Aqil Khan	7
	Urdu Section	

Talim-ul-Islam College Old Students Canada set a Milestone

Prof. Hamid Ahmad Chaudhry

They took a late start, but have surpassed all others. On 3rd of November 2012 the newly formed Talim-ul-Islam College old students association Canada organized a fund-raising dinner to finance poor students in Pakistan. The idea was initiated by the old students association in Germany, who in Hazur's words are the "Poineer" in organizing themselves in such a manner, but the financial contribution they started making for the scholarship fund has been relatively meager.

Mr. Lal Khan Malik, the National Amir, addressing the fundraising dinner

(Photo provided by brother S.H. Hadi)

It has been reported that they collected well over 16,000 Dollars in one evening and have presented to Hazur for scholarships to the deserving students in Pakistan. May Allah reward them for this sacrifice.

Even though everyone of those who have made monetary contribution for this noble cause, deserves appreciation and gratitude from all of us, but the much of the credit goes to the executive committee, especially to its finance secretary Sajjad Ahmad Malik, who told me in our very first brief meeting we had in Canada that he was determined to beat Germany in respect of scholarships. But we feel neither defeated nor jealous, but are satisfied and encouraged. After all they are our brothers. We certainly envy and wish to be equal to them. It is a matter of pride for a teacher to see the ones who he helped, achieve heights of glory are flying ever higher. Let us hope and pray that this spirit of the Canadian old students shall continue in years to come.

Members of the executive committee with the National Amir, Mr Lal Khan Malik

(Photo provided by brother S.H. Hadi)

The real truth is that there is a spirit behind readiness of our friends to make such sacrifices and this spirit has been infused by Ahmadiyyat and the inspiring guidance and leadership of Khilafat. Patronage of the National Amir, Mr. Lal Khan Malik, who is hard working, selfless, sincere, silent, loyal, devoted and unassuming leader must also have provided a motivation.

For me personally this wonderful achievement of the Association in Canada is all the more pleasing, because they have graciously accepted me as a life member of their organization. So I am literally one of them

Some of the speakers on the occasion (photo of sent by brother S.H. Hadi)

A Taste of the Past:

Those who have been reading Al-Manar of the T. I. College Old Students Association Germany, must have noticed that we have been including one or two pages from the magazines you used to read in the days of your studenthood.

This continues in this issue. Such Articles not only remind you of youth, your classmates and contemporaries, but also give us an idea of the intellectual level of the students of the college in those days. Unfortunately we do not have access to many of the old issues. We shall be grateful if friends, who are in possession of the past issues of Al-Manar, could get us their copies. We have also inserted some relevant old group photos in some articles, but we do not have many. I repeat my request to friends to help me provide group photos of the past, if they are in possession of any. This is how we can keep memories of our beloved institution fresh.

German Section of Al-Manar:

In compliance with the wish of Hazrat Khalifatul Masih-ul-Khamis (Ayyadahullaho Taala), to encourage our children to join T. I. College Old Students Association and to add a German Section to Al-Manar, I have been trying to persuade our children to join us. Even though I am not satisfied with the response, but it is not a complete disappointment. At least sixteen of our boys have taken the membership and paid the membership contribution. Some of them have also started writing for Al-Manar. Dr. Umair Ahmad Bajwa, son of Mr. Munawar Ahmad Bajwa contributed in one of the last issues of the magazine and Omar and Usman Mirza wrote on their father, late Mirza Mahmood Ahmad in the last issue. In this issue Miss Munnazza Aqil Khan, daughter of our brother Muhammad Aqil Khan has written on the existence of God and my own daughter Mrs. Areeba Dogar has written on Reaction of Muslims of blasphemous publications of some anti-Islam elements of the West. Areeba's article is based on the Friday sermon delivered by Hazrat Amirul Momineen Khalifatul Masih-ul-Khamis (Ayyadahullaho Taala). I hope we shall receive more co-operations like this from our other children in future.

A taste of the Past

Mubashar A. Solangi
B.Sc. II

URDU

Now Urdu, dear friends, I am sure you'll agree
Is the easiest language there ever could be.
The grammar is simple, exceptions are rare,
And only the spelling requires a little care.
In English the letters are just six and twenty
And that I should say is certainly plenty.
But in Urdu we have some nine letters more,
And they too are not needed, I am sure.
Now let us examine the letter and see,
Just how many there really need to be.
Let us start with ٹ , we have also got ت,
So why ط is needed, I really can't say.
And why should the number of حs be two,
When common sense says one ح would do.
محبوبہ I am sure is quite a nice word,
But why not مہبوبہ ? It seem absurd.
And why does Urdu need three kinds of "S",
Which makes the learner merely to guess.
If it is ص or ث or simply س ,
It makes it tougher than if it never had been.
And ض is a letter which causes dismay,
How easy would it be if ض were just ز ,
For ظ and ض and ذ seem to be,
A needless headache as all must agree.
So if we get rid of both ط and ح ,
ض , ذ , ظ , and ص , and ث ,
Then the spelling in Urdu I'm sure you agree,
Would present no more pain for you and me.

(Taken from Al-Manar January- March 1969)

Im Namen Allahs, des Gnädigen, des immer Barmherzigen.

Reaktionen von Muslimen auf blasphemische Taten

Frau Areeba Dogar, Frankfurt

In der ganzen Welt herrscht heute große Unruhe. Besonders in den islamischen Ländern ist große Empörung, Wut und Enttäuschung zu sehen. Grund ist wieder, dass einzelne Menschen die Gefühle Andersglaubender verletzen. Dieses Mal ist die Ursache eine abscheuliche Provokation eines Ungläubigen durch einen Film. Muslime fühlen sich beleidigt und fühlen sich in ihrer Religions - und Meinungsfreiheit bedroht. Sie revanchieren sich durch Randale und Unruhen. Der verheißene Messias (as) schreibt (warnt): „Muslime sind jenes Volk, das ihr Leben für die Ehre des heiligen Propheten (saw) lassen kann....“

Im heiligen Quran sagt Allah, dass man nicht Götter Anderer schmähen soll, da der Frieden der Gesellschaft so zerstört wird. Wenn ihr ihre Götter beleidigt, werden sie euren allmächtigen Gott verhöhnen (Sure Al-Anam, Vers 109: „Und schmähet nicht die, welche sie statt Allah anrufen, sonst würden sie aus Groll Allah schnähen ohne Wissen...“) Unfrieden wird im Land Einhalt erhalten. Wenn Menschen sich an diesem schönen Befehl Allahs gehalten hätten, wäre der Welt diese ganze Unruhe erspart geblieben.

Einzelne Regierungsführer der islamischen Länder haben ihre Aufgaben verfehlt. Das muslimische Volk hat nicht das Gefühl, ernsthaft vertreten zu sein, diese Unsicherheit der Einzelnen führt dazu, dass sie selbst auf die Straßen gehen, demonstrieren, leider auch demolieren und sich selbst Schaden zufügen; unter anderem auch auf Kosten von Menschenleben. Dies ist eine große Tragödie.

Hier sieht man den großen Unterschied zwischen den Nicht-Ahmadis und den Ahmadi-Muslimen. Die Ahmadis haben das Glück, ein Oberhaupt zu haben, unseren Khalifen, Hazrat Mirza Masroor Ahmad (aba). Er gibt der *Jamaat* das Gefühl, vereint zu sein und direkt mit Allah verbunden zu sein, durch Gebete. In kritischen Situationen sagt er der *Jamaat*, wie sie sich zu verhalten hat – nämlich durch stille Gebete und Leserbriefe, soweit es den Einzelnen in ihrer Macht steht.

Dieses Gefühl kennen die anderen Muslime nicht. Es fehlt ihnen dieses „Dach“ worunter sie sich vereint fühlen. Ohne Führung verirren sich die Leute mehr. Es fehlt ausreichendes quranisches Wissen. Analphabeten folgen unterschiedlichen Mullahs, die wiederum keine einheitliche Meinung vertreten. Verglichen mit der Macht der Kirche und der Rolle des Papstes in der katholischen, westlichen Welt, ist die Stellung der islamischen Religionsführer ganz minimal.

Langsam müssen Sie das schon gemerkt haben. Zudem kommt die Tatsache, dass unsere *Jamaat* schon seit Jahrzehnten gewohnt ist, von anderen gedemütigt zu werden, ganz besonders von den „Muslimen“. Deshalb weiß die *Jamaat*, besser mit dieser Art der

„Beleidigung“ umzugehen. Für die anderen Muslime ist der Umgang mit Beleidigungen relativ neu und selten.

Schade ist, dass obwohl der Islam die zweitgrößte Weltreligion ist, sie nicht „eine“ Kraft ist. Der Islam ist in 73 kleinen Gruppen gespalten. Dies entzieht dem Islam die notwendige Kraft/Macht, mit der es Einfluss auf der Welt haben könnte. Würden die Muslime Allahs Gebote respektieren, würden sie mit gemeinsamer Kraft gegen diese Aktionen vorgehen.

Reaktionen der Welt/ Medien:
Medien der Welt haben diesen provokativen Film und die Produzenten verurteilt; aber auch die explosiven Reaktionen der Muslime wurden verurteilt, denn diese waren gewiss nicht mit dem Befehl Allahs vereinbar.

Gewalt ist keine Lösung.
Einflussreiche Muslime sollten sich zusammentun und ihren Einfluss sowie ihre Macht nutzen, z. B. könnten muslimische Anwälte gemeinsame Petitionen einreichen. Politiker sollten in ihren Parteien auf ihre religiösen Gefühle aufmerksam machen und Respekt verlangen.
Aber die wichtigste Aufgabe hat die UNO (Vereinte Nationen)...Noch ist in der Magna Charta der UN nicht verankert, dass religiöse Gefühle anderer nicht verletzt werden dürfen.

Jede Nation schützt die Menschenrechte, unter anderem das Recht auf Meinungs- und Religionsfreiheit. Aber die Klausel „Schutz der religiösen Gefühle Andersglaubender“ fehlt.

Eins sollte deutlich gemacht werden: Die Meinungsfreiheit des einen hört auf, sobald das Gefühl eines anderen verletzt wird. Es ist die Aufgabe der Führer und Oberhäupter, ihr Volk über die wahren Lehren des Qurans aufzuklären. Wir müssen in dieser Zeit lernen, unsere Interessen gemeinsam zu vertreten, viel „Sadaqat“ geben und vor allem viel Darud auf unseren geliebten Propheten (Saw) schicken.

Allah Humma Salli ala Muhammadin wa ala ali Muhammad wa barik wa sallam.

Im Namen Allahs, des Gnädigen, des immer Barmherzigen

Existiert Gott?

Munnazza Aqil Khan

Die Frage, ob Gott existiert hat den Menschen von Anbeginn interessiert. Denn er sieht die Schöpfung und seinen Schöpfer im Alltag. Die Gegenstände um ihn hat irgendjemand hergestellt. Die Beobachtung der Natur in einem System, das bis in seine kleinsten Teilchen geplant ist, führt ihn zur Frage nach ihrem "Hersteller". So fragt sich der Mensch, wer ihn selbst und letztlich alles Leben und alle Materie auf der Welt erschaffen hat.
Im Heiligen Qur-an lesen wir in Sure 59, Vers 25: „Er ist Gott – der Schöpfer, der Bildner, der Gestalter. Ihm stehen die schönsten Namen zu. Alles, was in den Himmeln und auf der Erde ist, preist Ihn, und Er ist der Erhabene, der Allweise."

Wir kennen das Ursache-Wirkungs-Gesetz. Alles hat einen Schöpfer, aber auch die Gesetze haben einen Urheber; und all das, was wir sehen ist nur eine Kette in der Schöpfung. Gehen wir zu ihrem Ursprung zurück, so kommen wir zu Gott als „letzte Ursache aller Ursachen", wie Er, der Allmächtige und Allwissende sich selbst im Heiligen Quran in der Sure Najm erklärt. Unser Denkvermögen ist jedoch beschränkt, daher können wir das Unendliche nicht fassen. Ebendarum können wir Allah als größte Gewalt und höchste Macht niemals gänzlich erfassen. Was wir aber verstehen können, ist, dass alles Geschaffene vergänglich ist. Da Allah aber Schöpfer ist und nicht geschaffen worden ist, ist Er auch nicht vergänglich. Er erklärt hierzu im Heiligen Quran: "Sprich: "Er ist Allah, der Einzige; Allah, der Unabhängige und von allen Angeflehte. Er zeugt nicht und ward nicht gezeugt; Und keiner ist Ihm gleich" (Sure Al-Ikhlaas, Verse 2-5). Dennoch ist es etwas ganz Natürliches, dass sich jeder vernünftige Mensch fragt, ob Gott tatsächlich existiert. Dass Allah aber auch irgendwo in jedem angeborenerweise existiert, beweist sich auf Grund der Tatsache, dass jeder Mensch sich in Notsituationen, wenn es ihm also sehr schlecht geht, letztlich nur an Gott wendet, ob Atheist oder Gläubiger, Jeder ruft dann: „O mein Gott!" oder mit einer Eigenschaft „Ach du lieber Gott!" und bittet Ihn den Allmächtigen um Hilfe.

Der Verheißene Messias (Friede sei auf ihm) schreibt über die göttliche Erscheinungsweise: „Derjenige, der nicht vom Zweifel befreit ist, ist zugleich vor Bestrafung nicht sicher." Allah erklärt im Heiligen Quran, dass Er uns erschaffen hat, damit wir uns in Seinen Eigenschaften färben und Ihm dienen. Dafür verspricht er Sein Wohlgefallen und Lohn. Wie die Worte des Verheißenen Messias (Friede sei auf Ihm) veranschaulichen überkommt wiederum Jenen Strafe, der nicht an Gott glaubt.

Somit kann man erst einmal festhalten, dass es keinesfalls schaden kann, an Gottes Existenz zu glauben, da dies ja nur mit hohen moralischen Eigenschaften verbunden ist. Ein Leben ohne den Glauben an Gottes Existenz hingegen resultiert in größter Strafe. Man muss aber bereit sein, Gott zu suchen und zu erkennen, um ihn zu finden. Denn häufig äußern Atheisten, dass sie bereit seien Gott anzunehmen, wenn Er ihnen vorgeführt werde, sehen ihn aber nicht und lehnen ihn daher weiterhin ab. Wie kann aber jemand der eine voreingenommene Grundeinstellung hat, überhaupt etwas erkennen? Wenn jemand etwa nicht bereit ist, die Augen zu öffnen und mit geschlossenen Augen sagt, er könne nicht

sehen, sei blind, dann wird er auch nicht sehen können. Wenn aber zumindest für eine bestimmte Zeit seine Einstellung ändert und die Augen öffnet, kann es zwar sein, dass er immer noch Nichts sieht. Aber vielleicht befindet sich der Betroffenen ja in einem absolut dunklen Raum, ist also in der falschen Umgebung und muss sich ein wenig anstrengen, um zu erkennen, dass er tatsächlich sehen kann.

Hierzu führt der Verheißene Messias (Friede sei auf ihm) aus: Ich spreche die Wahrheit und Nichts, als die Wahrheit. Wenn Seelen mit einer ernsthaften Sehnsucht zur Suche begabt und Herzen nach Wissen durstig werden, dann wird die Menschheit danach streben, jenen Pfad und jenen Weg zu entdecken […] seid beruhigt, dass es nicht Gott ist, der der Offenbarung ein Ende bereitet hat, sondern es ist der Mensch, der, um seinen Verlust zu rechtfertigen, Zuflucht bei dieser falschen Entschuldigung sucht. Begreift doch völlig, dass so, wie es nicht möglich ist, ohne Augen zu sehen oder ohne Ohren zu hören oder ohne Zungen zu sprechen, es gleichfalls nicht möglich ist, den Anblick unseres geliebten Gottes zu erlangen, ohne die Hilfe des Heiligen Qur-ans (aus Ruhani Khazain, Band 1, Braheen-e-Ahmadiyya, Seite 191).

Oder man stelle sich vor, etwas verloren zu haben. Ohne zu suchen ist es doch nicht zu finden. Wie soll man also Gott finden, wenn man gar nicht nach Ihm sucht?

Aber warum ist es so schwer, Gott zu finden und an Seine Existenz zu glauben? Es ist nun einmal so, dass wir den sichtbaren Dingen mehr Glauben schenken, als Dingen, die wir mit dem physischen Auge nicht sehen. Jedoch ist dies nicht richtig. Wir alle glauben doch auch, dass Luft existiert oder zum Beispiel Erdanziehungskraft, obwohl wir sie nicht sehen. So wie wir Kräfte durch physikalische Experimente beweisen können und Luft in Form von kaltem Wind oder bei Sauerstoffmangel durch die erschwerte Atmung spüren können, genau so kann man auch Gott „beweisen“ und „spüren“. Denn Gott hört und spricht auch heute. Es ist nur von uns abhängig, ob wir dies annehmen, oder nicht.

Es ist nicht verständlich, dass Menschen glauben können, die Welt in ihrer perfekten Form bis hin in die kleinsten Details hinein, sei durch einen Zufall entstanden. Selbst größte Physiker wie Newton oder Einstein haben dadurch Gottes Existenz erkannt. Denn Gott ist nicht planlos und die Zufallsvorstellung ist so, als würde man die Buchstaben des Alphabetes jeweils auf einzelne Blätter schreiben, in die Luft werfen und denken, sie würden dann geordnet auf den Boden fallen. Die Welt kann also nicht zufällig makellos erschaffen sein, es muss einen allmächtigen Schöpfer geben, der frei von Fehlern und Makeln ist.

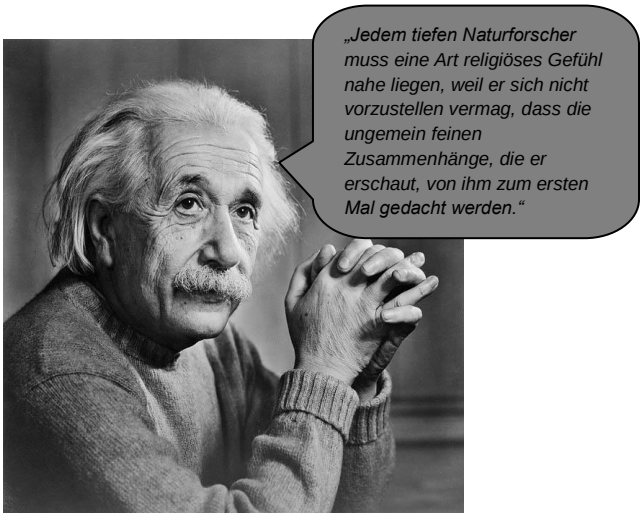

Albert Einstein (1879-1955), Physiker

Letztlich stellt sich aber auch die Theodizee-Frage: Wenn Gott existiert, der auch noch barmherzig und allverzeihend sein soll, warum lässt Er dann so viel Schlechtes, Leid und Böses zu? Nun, Gott hat für Gutes gesorgt und es geschaffen, das Schlechte verursachen wir. Etwa die großen Naturkatastrophen, durch Abholzen von Wäldern, Raubbau, Naturzerstörungen. All das ist vom Menschen „hausgemacht“. Jedoch verursacht Gott auch dort Schlechtes, wo Ihm nicht gedient wird. Er erinnert hieran und sorgt für Erleichterung, wenn man ihm auf Grund der Not dient und Ihn um Hilfe bittet. Erst dadurch kann sich jener Mensch, der sich von Gott entfernt hatte, wieder zu Gott wenden und Ihm dankbar sein. Es ist so gesehen also auch wieder ein Zeichen Seiner Barmherzigkeit für uns schwache Menschen. Obwohl wir sündhaft sind, lenkt Er uns wieder auf den „Seerat-al-Mustaqeem“, den rechten Weg.

Hierzu sei erläuternd noch eine Anekdote aus einem Hörsaal genannt:

„Ein Universitätsprofessor der Physik forderte seine Studenten mit folgender Frage heraus: ‚Gott schuf Alles, was existiert, richtig?‘ Ein Student antwortete mutig: ‚Ja, er schuf Alles!‘

Der Professor fuhr fort: ‚Wenn Gott Alles erschaffen hat, dann schuf er auch das Böse, denn das Böse existiert und gemäß der Annahme, dass unsere Werke uns selbst widerspiegeln ist Gott somit böse.‘

Sir Isaac Newton (1643-1727), englischer Naturforscher

Der Student blieb stumm nach dieser Antwort und der Professor rühmte sich triumphierend einmal mehr bewiesen zu haben, dass der Glaube Mythos sei.

Ein anderer Student hob seine Hand und sagte, Kann ich eine Frage stellen, Herr Professor? ‘

, Natürlich‘, antwortete der Professor.

Der junge Mann erhob sich und fragte den Professor nacheinander, ob Kälte oder Dunkelheit existierten. Der Professor bejahte selbstverständlich. Der Student erklärte: ‚Nein, Kälte und Dunkelheit kann man nicht messen und existieren nicht, denn es ist nur die Abwesenheit von Wärme oder Licht, was man wiederum messen kann. Und wenn man Kälte und Dunkelheit messen kann, dann nur wegen ihrer Gegenstücke. Wir können also nur sagen, wie dunkel es in einem Raum ist, wenn wir sagen, wie wenig Licht dort ist. Genauso sei es mit dem Bösen. Das Böse existiert nicht oder zumindest nicht aus sich selbst. Das Böse ist schlicht die

Abwesenheit Gottes; ist - genau wie die vorigen Beispiele - ein Begriff, den der Mensch erfunden hat, um diese Abwesenheit Gottes zu beschreiben. Es verhält sich damit nicht wie mit dem Glauben oder der Liebe, die existieren wie die Wärme oder das Licht. Das Böse ist das Ergebnis dessen, dass der Mensch Gott nicht in seinem Herzen gegenwärtig hat. So wie er es kalt empfindet, wenn Wärme fehlt oder dunkel, wenn kein Licht da ist.‘

Darauf nickte der Professor mit dem Kopf und schwieg.“

Der junge Student soll Albert Einstein gewesen sein.

Schließlich bete ich, dass Allah uns befähigen möge, den Bund mit Ihm stets aufrecht zu erhalten und zu stärken, auf dass wir Sein Wohlgefallen erlangen mögen - Ameen.